قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا ستترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ستمبر 2020ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے









ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وِکدے



طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتماب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ستمبر2020ء

جلد 73 | شمارہ نمبر 09

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: تو اگر بھول، گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو	ادارہ	4
قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے	مولانا الطاف حسین حالی مرحوم	5
طاؤس ورباب آخر!	ادارہ	18
قانون سے استثناء	خواجہ ازہر عباس، کراچی	24
میں ناخوش و بے زار ہوں مرمر کی سِلوں سے	خالد بشیر فاروقی، لاہور	30
انسانی عقل، اس کی حدود اور مکافاتِ عمل	ڈاکٹر اعجاز رسول، گلاسگو، یوکے	34
اللہ کا مخلوق کے بطورِ خالقِ کل مقتدرِ مطلق کا تصور	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	49

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah *Al-'Hujraat* الحجرات Durus-al-Qur'an: Chapter 4 60

By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تو اگر بھول، گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو

14 اگست یومِ آزادی کی تقریب پر، ملک کے راہنماؤں میں سے ہر ایک نے یہ کہا کہ ہمیں قائداعظم کے ان ارشادات کو یاد رکھنا چاہئے جو انہوں نے حصولِ پاکستان کے سلسلہ میں فرمائے تھے۔ قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (اپریل 1943ء) کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا۔

Here I should like to give a warning to the landlords and capitalists who have flourished at our expense by a system which is so vicious, which is so wicked and which makes them so selfish that it is difficult to reason with them. (Tremendous applause.) The exploitation of the masses has gone into their blood. They have forgotten the lessons of Islam. Greed and selfishness have made these people subordinate to the interests of others in order to fatten themselves. It is true we are not in power today. You go anywhere to the country-side. I have visited villages. There are millions and millions of our people who hardly get one meal a day. Is this civilisation? Is this the aim of Pakistan? (Cries of no, no.) Do you visualise that millions have been exploited and cannot get one meal a day! If that is the idea of Pakistan I would not have it. (Cheers.) If they are wise they will have to adjust themselves to the new modern conditions of life. If they don't God help them; we shall not help them. (Hear, hear, renewed cheers and applause)

اس مقام پر میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے، کہ وہ کسی معقول بات کو سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے خون میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں۔ جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن مجید میں

اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟

آج چاروں طرف سے یہ شور سنائی دے رہا ہے کہ پرویز صاحب قرآن کریم کے بعض الفاظ اور آیات کی جو تشریح و تفسیر بیان کرتے ہیں، وہ تفسیر متقدمین کے ہاں نہیں ملتی، اس لئے وہ ردکر دینے کے قابل ہے اور پرویز صاحب کا یہ طرزِ عمل دین میں فتنہ (اور نہ جانے کیا کیا) ہے۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے یہ اعتراض نیا نہیں۔ ہماری پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مسلمانوں میں جب بھی کسی صاحبِ علم و بصیرت نے اپنے غور و فکر سے کوئی ایسی بات کہی جو اسلاف کے ہاں نہیں ملتی تھی، اسے ملحد و زندیق قرار دے دیا گیا اس لئے کہ ان قدامت پرستوں کے نزدیک ندرتِ فکر و خیال بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم میں لے جاتی ہے۔

جب اسی قسم کے اعتراضات سرسید کے زمانے میں اٹھائے گئے تو حالی مرحوم نے ان کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا جو رسالہ معارف علی گڑھ کی دسمبر 1899ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس مقالہ کو (غیر متعلقہ نظائر و حواشی کے حک کے بعد) درج ذیل کرتے ہیں۔

سرسید کے متعلق اس مقام پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج ہمیں، پاکستان کی شکل میں جو خطۂ زمین میسر ہے اور جس میں ہمارے اربابِ شریعت، اقامتِ دین اور نظامِ شریعت کی تنفیذ و ترویج کے خواہاں ہیں، یہ اسی مردِ حق آگاہ و حقیقت شناس کی دور نگہی کا تصدق ہے۔ اگر اس وقت سرسید اتنی ہمت اور جرأت سے کام نہ لیتا (اور مولوی صاحبان کی اچھالی ہوئی کیچڑ سے مرعوب ہو جاتا) تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں بالکل اسپین کا نقشہ دکھائی دیتا۔

جہاں تک سرسید کی تفسیر کا تعلق ہے اس کے بیشتر مقامات سے ہمیں اختلاف ہے لیکن جس اصول کے ماتحت اس نے تفسیرِ جدید کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اس سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ علاوہ ازیں، سرسید نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ غلطی سے مبریٰ اور وحی کی طرح واجب التسلیم ہے۔ اس کے برعکس، اس نے اپنے ایک لیکچر میں (جو ''اسلام'' کے عنوان سے لاہور میں دیا گیا تھا) اس کا اقرار کیا ہے کہ

> میں معصوم نہیں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء

اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔
میرے خیال میں مخالفین اور مشککین فی الاسلام کے مقابلہ میں اسلام کی تائید اسی طریقہ پر ہوسکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہوسکتی۔

بعینہٖ یہی کچھ پرویز اپنے متعلق کہتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ:

اس حقیقت کو میں معارف القرآن کی سابقہ مجلدات میں بار بار پیش کر چکا ہوں۔ اور پھر اس کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ قرآن کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی ہے۔

(معراج انسانیت، فاتحۃ الکتاب)

نیز یہ کہ جو کچھ ہم قرآن سے آج سمجھ سکتے ہیں، وہ لامحالہ ہمارے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی ہو سکتا ہے جب زمانہ علمی اعتبار سے آگے بڑھ جائے گا تو اس کے لئے ہمارا فہم قرآن کافی نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دور میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ قرآن کے متعلق اس وقت سمجھا جا رہا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔

(سلیم کے نام، نیز دیگر مقامات)

باقی رہے صاحبِ مضمون (جناب حالیؔ) سو ان کے متعلق اس سے بہتر اور کیا کہا جائے گا جو اقبال کہہ گیا ہے

طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجا نہا شور افگندے کہ من دارم

یہ بھی عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح ہمارا ملا اس حالی کو منکرِ حدیث اور منکرِ شانِ رسالت قرار دیتا ہے جس نے حضور سرورِ کائنات ﷺ کی شانِ اقدس میں وہ نعت کہی جس کا کوئی جواب نہیں۔ یعنی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
(الخ)

اسی طرح آج اس پرویز کو (معاذ اللہ) منکر کہا جاتا ہے جس نے سیرتِ طیبہ پر وہ کتاب (معراجِ انسانیت) پیش کی ہے جس کی مثال (کم ازکم) اردو لٹریچر میں کم ملے گی۔

بہر حال، یہ ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ اب آپ حالیؔ کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوع اسلام)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اعتراض:

سرسید کی تفسیر جس میں بیسیوں آیات کے معانی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں اس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ باوجود بیشمار تفسیروں کے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقت قرآن مجید کی لکھی گئی ہیں اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کونسا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کو علمائے سلف نے طے نہ کر لیا ہو؟ اولاً رسولِ خدا ﷺ نے جن کے برابر قرآن کا علم کسی امتی کو نہیں ہوسکتا جن آیتوں کے معانی بیان کرنے کی ضرورت تھی خود زبانِ مبارک سے ان کا مطلب ارشاد فرما دیا۔ پھر آپ کے بعد صحابہؓ، تابعین تبع تابعین اور علمائے امت نے جو یقیناً اس زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے۔ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کر

دیا۔ پس زمانہ حال کے مفسر کے لئے اس کے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ انہی تفسیروں کا ماحصل جو علمائے سلف لکھ گئے ہیں زیادہ شرح و بسط یا زیادہ اختصار یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دے۔ یا ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کا ترجمہ کر دے۔ یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک بھی آیت کے معنی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کئے ہوں۔ چنانچہ اسی شبہ کی بنا پر بعض ستم ظریفوں کو کہتے سنا ہے کہ جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا نہ نبی کو نہ صحابہ و تابعین کو اور نہ دیگر علمائے امت کو۔

محکمات و متشابہات:

اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ **حجۃ اللہ البالغہ** میں مذکور ہے۔

محکمات وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو۔

متشابہات۔ وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معانی متعددہ کا احتمال ہو سکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؟ امام رازی نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں۔ مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انہوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ ''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص و عوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراکِ حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ان کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے تو ان کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ پس تقاضائے حکمت یہی تھا کہ ان کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ ان کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں۔''

اندازِ تخاطب:

شاہ صاحب نے اسی مطلب کو حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ''شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقایق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے ان کی اصل خلقت میں ودیعت تھی ان سے خطاب کیا ہے اور اسی لئے (ان کی سمجھ کے موافق) فرمایا: **الرحمن علی العرش استویٰ**۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے ایک حبشیہ عورت سے پوچھا کہ ''خدا کہاں ہے؟'' اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ مومنہ ہے۔'' یعنی آنحضرت ﷺ نے باوجودیکہ آپ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے اس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اس کے ایمان کے لئے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے امیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر

بالا جمال ایمان لانا کافی تھا اور ان کو مجاز و استعارہ اور تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے تاکہ امی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں۔

عہد عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں چونکہ اس زمانے میں القا کی گئی تھیں جبکہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لئے ان میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارے پر رکھی گئی ہے۔

اسی لئے شاہ ولی اللہ صاحبؒ انبیاء کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ ''ومن سیرتھم ان لا یکلموا لناس الا علیٰ قدر عقولھم التی خلقوا علیھا وعلو مھم التی ھی حاصلۃ عندھم باصل الخلقۃ۔''

متشابہات کی تاویل: تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضروری ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے ''وما یعلم تاویلہ الا اللہ'' اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل متشابہات کے متعلق لکھتے ہیں۔ یبعد ان یخاطب اللہ عبادہ بمالا سبیل لاحد من الخلق الی معرفتہ وقد اتفق اصحابنا و غیرھم من المحققین علی انہ یستحیل ان یتکلم اللہ تعالیٰ بمالا یفید یعنی بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے معنی سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لئے نہ ہو اور ہمارے علمائے مذہب اور ان کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہ ہو محال ہے۔

غرضیکہ آیت مذکورہ کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم قطعاً نہیں دیا گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدا و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیاتِ متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو یومنون بالغیب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا ور اس لئے انسان جن الفاظ و عبارات سے ان حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنیٔ مقصود سے قاصر ہوگی۔

طیبی شرح مشکوٰۃ میں لکھتا ہے کہ المتشابہ الذی یحذر منہ ھو صفات اللہ تعالیٰ التی لا کیفیۃ لھا والاوصاف القیمۃ التی لا سبیل الیٰ ادراکھا بالقیاس والا ستنباط ولا سبیل الی استحضارھا فی النفوس۔ یعنی جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا حکم ہے وہ صفاتِ باری تعالیٰ یا قیامت کے حالات کا بیان ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہو سکتا اور نہ لوگوں کو اس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہے۔''

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیاتِ متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً سورۂ تکویر میں ہولِ قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہے واذا العشار عطلت یعنی جبکہ عنقریب بیاہنے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور ان کی کوئی خبر نہیں لے گا بے شک ہول قیامت کی

جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اس کی قدرت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے لیکن یہ سمجھنا اس کی طاقت سے باہر نہیں ہے کہ یہ بیان اس کیفیت کی تمثیل ہے اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی اس کو ہولِ قیامت کا تصور دلانے کے لئے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیاہنے کے قریب ہو اس وقت مالک اس کی نگرانی سے غافل ہو جائے۔ پس انہوں نے اس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جبکہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کا ہوش باقی نہ رہے گا۔

اسلاف کا مسلک:

لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلف صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لئے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباع متشابہات پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلاوطن کر کے بصرے کو بھجوا دیا۔ اور جب امام مالک سے استواء علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ ''استواء کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے۔''

سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا' اس وقت اہل کتاب تحریفِ کتبِ مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے وہ اکثر اپنے اغراضِ فاسدہ کے لئے کتبِ مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہلِ کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہوسکتی اور اہل کتاب اس کی مثال قائم کر چکے تھے اور چونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصولِ دین میں عموماً باہمدگر مشابہت رکھتے تھے اس لئے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا۔ لہٰذا ان میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسدادِ تحریف کے لئے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیاتِ متشابہات کے معنی میں (1) چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ اور آنحضرت ﷺ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ من فسر القران برایہٖ فلیتبوٴ مقعدہ من النار اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا کہ من کذب علی متعمدا فلیتبوٴ مقعدہ من النار اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا کہ من کذب علیٰ متعمداً فلیتبئو مقعدہ من النار۔ اسی بناء پر سلف صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اس سے حذر کرتے

(1) یعنی جو حقائق انسانی عقل سے ماوراء ہیں اور ان کا بیان مجاز و استعارہ کی شکل میں ہوا ہے ان کی کنہ و حقیقت متعین کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (طلوع اسلام)

تھے پھر بھی جو آیتیں تشبیہہ پر دلالت کرتی تھیں اس کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے اور ان کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیاتِ متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انکے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھے ہیں تصدیق کرتے ہیں اور ان کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں کیونکہ ان کو سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ید یا وجہ یا استواء کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انہیں الفاظ کو بعینہٖ ترجمے میں رکھ دیتے تھے۔ حالانکہ عربی زبان جس میں شاعری نزول قرآن کے وقت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی استعارہ و کنایہ اور اقسام مجاز سے مالا مال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا۔ باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے تاویلِ متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کے تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اس کی موید نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اس کی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں۔ چنانچہ امام غزالی اور صاحب مجمع البحار اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت ﷺ کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل نعوذ باللہ بیکار ٹھہرتا ہے۔ باوجود اس کے کہ سلفِ صالحین جہاں تک ہوسکتا تھا بغیر روایت کے سنے تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے۔ تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا راستہ محدود رہے۔

ہمارے زمانے کا تقاضا:

لیکن یہ مصلحت اسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب ان کے اصلی معنی بیان کرنے سے علماء نے سکوت کیا اور ان کو محض حقیقی معنوں پر مقصور رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفہ کا رواج زیادہ ہوتا گیا اسی قدر آیاتِ متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون و چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے۔ اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض ازراہِ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجازاً استعارہ کے طور پر اطلاق کئے گئے ہیں بقدرِ ضرورت ان کے اصلی معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

چنانچہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی۔

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلم ٹھہر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے۔ یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اس کو اصولِ

عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہئے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔

یہ اصول علمِ کلام کی عام کتابوں مثلاً مقاصد۔ مواقف۔ تفسیر کبیر، دُررِ غُرر، تہافتہ الفلاسفہ اور فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ حمیدیہ حکمائے زمانہ حال کے مقابلہ میں لکھی ہے۔ اس میں بھی اس اصول کو قاعدہ مسلمہ اہل اسلام قرار دیا ہے بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزاتِ حسیہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے کہ علیھم ان یقنعوا بما تقبلہ عقولھم ثم مالم تقبلہ و یرفضہ البرھان العقلی القاطع یرجعون فیہ الی التاویل الجامع بین النقل والعقل (حمیدیہ، ص:38) یعنی ان کو چاہئے کہ جس بات کو ان کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے۔

پہلے بھی ایسا ہوا ہے: اگرچہ ابوالحسن اشعری جو کہ فرقہ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر ان کی یہ ممانعت صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہیں کیونکہ ضرورت کے وقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب وسنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔ امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب ہیں رسالہ التفرق بین الاسلام والزندقۃ میں لکھتے ہیں کہ ''اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس مقام پر ہم آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیاتِ متشابہات کے معنی ابتداء میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم وحکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے ان کے کیا معنی قرار دیئے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ آیا ہے اس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم (جو زمین وآسمان پر محیط ہے) سمجھا جاتا تھا۔ بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش وکرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے۔ بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علماء کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کئے جائیں۔

مزید تحقیق کی ضرورت: لیکن چونکہ اس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھیں اس لئے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں اس زمانہ میں ان کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں ان کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظِ قرآنی میں شک اور وسوسے نے راہ نہیں پائی لوگ ان آیتوں کے الفاظ کو (جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا

ہونا مفہوم ہوتا ہے) ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے۔ اور اب تک بھی ان ملکوں کے بعض علماء (1) جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم وحکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائل قاطعہ سے زمین کی گردیت ثابت ہوگئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فَرَشْنٰهَا اور دَحٰىهَا اور طَحٰىهَا اطلاق کئے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اس وقت زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لئے قرآن کے بعض الفاظ جو زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون و چرا نہیں کی لوگ ان آیتوں کو ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ درحقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سماء جو قرآن میں جابجا وارد ہوا ہے۔ اس سے مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان درحقیقت کوئی جسم محیطِ عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے جس کا نام جاذبیہ یعنی کشش ہے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اس لئے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود ہونے یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔

اشعریہ اور معتزلہ:

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی۔ اس لئے ان کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا اور سب سے بڑا مانع تاویلِ متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری جو تاویلِ متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لئے اس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا اور معتزلہ جنہوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلہ میں سب سے پہلے تاویلِ متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور ان کو عندالضرورت واجب سمجھتے تھے' جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اس قدر وہ' ان کا مذہب اور ان کے اصول اور ان کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا۔ یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ دنیا سے معدوم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں ان کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں صرف ان کے اقوال جستہ جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے

---

(1) شیخ حسین آفندی نے رسالہ حمیدیہ میں اپنے زمانہ کے ایک قشیری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دین اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے زمین کی گردیت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔ شیخ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کردیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں'' حالی۔

جاتے ہیں۔ چنانچہ قفالؒ جن کا قول کرسی کی تفسیر میں امام رازی نے نقل کیا ہے وہ بھی معتزلہ میں شمار کئے گئے ہیں۔

اگرچہ امام ابوالحسن اشعری سے جیسا کہ علامہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بناء پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تاویل کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجتہ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

من اصول الدین ترك الخوض بالعقل فی المتشابهات من الكتاب و السنة اس کے بعد فرماتے ہیں ومن ذلك (ای من المتشابهات) امور كثير لا يدری اريدت به حقيقة الكلام او المجاز اقرب اليها وذلك فی لم يجمع عليه الا اللامة ولم ترتفع فيه الشبهة۔ یعنی قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں جن کی نسبت نہیں معلوم کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں اور یہ تردد ان بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اور اشتباہ رفع نہیں ہوا۔''

شاہ ولی اللہؒ کا مسلک:

شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ ان مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو متحمل ہیں ان سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔

قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے تفسیر کبیر اور حجتہ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے اس کا طرز بیان ایسا ہونا چاہئے کہ ہر طبقہ اور ہر درجہ اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اس سے ہدایت پا سکیں۔ جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو اس وقت بھی اس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو۔ ورنہ اس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے۔

قرآنی حقائق لامتناہی ہیں:

علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب ''مدخل'' میں لکھتے ہیں قال عليه الصلوٰة والسلام فی القران لا تنقضی عجائبه ولا يخلق علیٰ كثرة الرد فعجائب القران لا تنقضی الی يوم القيمه فكل قرن لا بدله ان ياخذمنه فوائد جمة خصه الله تعالیٰ بها وضمها اليه بركة هذه الامة سائرة الی يوم الساعة۔'' یعنی ''آنحضرت ﷺ نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ ''اس کے عجائب یعنی دقائق واسرار جو اس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دہرانے کے پرانا

نہ ہوگا۔'' پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اس لئے ہر زمانہ کے لوگوں کو چاہئے کہ اس سے فوائد کثیرہ جوان کے حصے میں آئے ہیں حاصل کریں تا کہ اس امت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں ''قال علیہ الصلوٰۃ والسلام مثل امتی کمثل المطر لا یدری اولہ خیر ام اخرہ۔ یعنی فی البرکۃ والخیر والدعوۃ الی اللہ تعالیٰ و تبئین الاحکام یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میری امت کی مثال مینہ کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر'' یعنی برکت اور خیر میں' لوگوں کو خدا کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں۔

دونوں مذکورہ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقائق و اسرار امت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اس کے اخیر قرنوں میں بہت سے دقائق و اسرار دنیا پر منکشف ہوں گے۔

امام حجۃ الاسلام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ کم من معان دقیقۃ من اسرار القران یخطر علی قلب المتجر دین للذکر والفکر یخلو عنہا کتب التفاسیر ولا یطلع علیہا افاضل المفسرین یعنی قرآن کے ایسے بہت سے دقائق و اسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو ان کی خبر نہیں ہوتی ان لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی اعتراض کا جواب

(قرآن مجید میں مزید تفسیر کی گنجائش باقی نہیں ہے)

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہوگا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئی ہیں قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا۔ بہت سے مقامات اس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقائق و اسرار ایسے باقی ہیں جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اجماع امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں۔ آیا عندالضرورت اجماع امت کے خلاف ان مقامات میں خوض کرنا اور ان متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ان کے معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

تقاضائے وقت: ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام پر اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ

ضرورتیں ممنوعات کو مباح و جائز کر دیتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا چونکہ ان کو اس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں مکروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لئے حلال کر دوں جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کر دوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے۔

ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہ بصرہ سے کہا کہ قرآن و حدیث کے بغیر کوئی فتویٰ نہ دینا اگر تو نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اوروں کو بھی ہلاک کرے گا۔

ابوسلمہؒ جب بصرے میں آئے تو انہوں نے حسن بصری سے کہا کہ ''میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو سو کبھی بغیر قرآن وحدیث کے فتویٰ نہ دینا۔''

شعبیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا تو وہ ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو اور دوسرا تیسرے کی طرف۔ یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی۔ یعنی جب کسی کو اس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے۔

مگر آخر کار ضرورتوں نے قیاس کو ایسی ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب وسنت کا ہم پلہ اور دلائل شرعیہ سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلہ میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے دیکھ کر نہایت غیظ وغضب میں ارشاد کیا تھا کہ ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت مگر جب ضرورت داعی ہوئی تو علماء کو چار و ناچار اس پر بحث کرنی پڑی۔ بنی امیہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لئے سخت خونریزیاں ہونے لگیں اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ مسلمان کیوں قتل کئے جاتے ہیں؟ تو ان کو یہ جواب ملا کہ القدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ آخر کار علماء کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور اس قدر کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

متشابہات کی تاویل میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب تک شک اور وسوسے کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علماء کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے چونکہ ان میں کثرت سے آیاتِ متشابہات وارد ہوئی تھیں اس لئے اگرچہ ایک مدتِ دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جس قدر علمِ انسانی ترقی کرتا گیا اسی قدر ان کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے منکشف ہوتے گئے۔

قرآن مجید میں جو الفاظ یا آیتیں اب تک ایسی موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ ان کے معنی متعین کرنے کا وقت اب آ پہنچا ہے تو اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنی اصولِ عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے رفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنے اختیار کئے جائیں اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں۔

بینا و نابینا: مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسی ضرورت سردست درپیش ہے جو محظورات کو مباح کر دیتی ہے؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ:

جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں مخالفت کی کوئی آواز نہیں پہنچی ان کے نزدیک تو اس کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے اس کو فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے ان کے حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہے کہ

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہے ناخدا جب

مگر وہ لوگ جو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہے۔ اسی قدر مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں۔ ان کو وہ ضرورت روز روشن کی طرح نظر آتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکمائے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلف صالح کے برخلاف تاویل متشابہات پر مجبور کیا تھا وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حد غایت کو پہنچ گئی ہے۔ اس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علماء و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لئے حاصل کرتے تھے مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگئی ہے۔ ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو، تاجر ہو یا اہل حرفہ ہو مجبور ہے کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اس لئے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہوگئی ہے اس کے سوا اس زمانے کے علوم زیادہ تر محض قیاسات پر مبنی تھے اور اس لئے جو شبہات ان سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے ان کے دفعیے کے لئے اکثر حالتوں میں صرف لانسلم کہہ دینا کافی تھا۔ مگر اس زمانہ میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقراء پر رکھی گئی ہے اور اس لئے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں وہ صرف لانسلم کہہ دینے رفع نہیں ہو سکتے۔

غرضیکہ گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں اب غلط ثابت ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں۔ اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلمات غلط ثابت ہو جائیں لیکن چونکہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اس لئے بہت ہی کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے تک پہنچ گئے ہیں ان میں آئندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں جب تک کہ اس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے ضروری ہے کہ یا تو قرآن کو حقائق محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اس کے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں (1) مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیاتِ متشابہات پاتے ہیں کہ اگر ان کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو نہ ہم کو اصولِ عربیت کے خلاف تکلفات لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوبِ بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے اور باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو ان آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں بالکل رفع ہو جاتے ہیں اور اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہور مفسرین نے ان کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

---

(1) طلوع اسلام کا اس باب میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ مسئلہ زیر نظر کے متعلق جو کچھ ہمارے زمانے نے معلوم کیا ہے وہ حرفِ آخر نہیں ہمیں اس باب میں مزید تحقیق کا انتظار کرنا چاہئے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہوگی تو اس کی تحقیق یقیناً قرآن کی تائید کرے گی۔

یہ جدت طرازیاں:

جولوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ:

''جومعنی قرآن کے انہوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔ سوشاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہومگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے۔''

یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جومعنی سرسید نے قرآن کے بیان کئے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے یا نہیں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اس زمانے میں جبکہ قرآن نازل ہوا مخاطبین پر ظاہر کرنا شارعؑ کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا۔

صاف بات:

ہم اوپر بحوالہ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادھی سمجھ کے موافق (جو علم وحکم تک پہنچنے سے پہلے اس کی خلقت میں ودیعت تھی) خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقائق مجاز استعارہ وتمثیل کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ جب تک مخاطبین اپنی عقلِ طبعی سے ترقی کر کے علم وحکمت کے اعلیٰ درجہ تک نہ پہنچیں اس وقت تک جومعنی ان الفاظ سے بظاہر متبادر ہوں انہی پر قانع رہیں۔ مگر جوں جوں حقائقِ اشیاء ان پر منکشف ہوتے جائیں اسی قدر ان الفاظ کے معنی مقصود ان پر کھلتے جائیں۔ پس جومعنی قرآن کے اب یا آئندہ ایسے بیان کئے جائیں جو اصولِ عربیت اور اسلوب قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے ان کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے بخوبی رفع ہوتا ہو اس کی نسبت صرف اس بناء پر کہ نزول قرآن کے وقت شارع نے ان کو بیان نہیں کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معنے نہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے مسئلہ جبر وقدر کی نسبت اس کے سوا کچھ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو اس پر بحث کرتے دیکھ کر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا۔ باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی تو صحابہ ہی کے وقت میں اس پر بحث شروع ہوگئی۔ چنانچہ عمرو بن عاص اور ابوموسیٰ اشعری میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل ونحل شہرستانی میں مذکور ہے اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے ان آیات کی تفسیر میں جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں اس مسئلہ پر کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جومعنی ان آیتوں کے ہمارے علماء اور ائمہ نے بیان کئے ہیں وہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسول کو۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ:

سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے وہ کہاں تک اصولِ عربیت اور اسلوبِ قرآن کے موافق ہے؟

جن اعتراضات کو رفع کرنے کی غرض سے انہوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے ان کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟

جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا انہوں نے قرار دیا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟ سو ان عنوانوں پر ہم آئندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔ (1)

(1) یہ مزید بحث ہماری نظر سے نہیں گذری۔ نہ ہی اس کی اب چنداں اہمیت باقی ہے۔ (طلوع اسلام)

طاؤس ورباب آخر!

(جہاندار شاہ سے محمد شاہ تک)

(ماہنامہ نگار (پاکستان) کی فروری 1962ء کی اشاعت میں جناب نیاز فتحپوری کے قلم سے ذیل کا مقالہ شائع ہوا تھا اس پر ہمارا تبصرہ آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔ طلوع اسلام)

کس قدر عجیب بات ہے کہ مغلیہ حکومت ڈیڑھ سو سال میں انتہائی عروج تک پہنچی اور ٹھیک اتنی ہی مدت میں وہ زوال پذیر ہو کر ختم ہو گئی۔ یعنی اکبر اعظم سے لے کر وفات اورنگ زیب (1556ء سے 1707ء) تک پورے ڈیڑھ سو سال وہ برابر ترقی کرتی رہی اور اس کے بعد (1707ء سے 1857ء تک) اتنی ہی مدت میں اس کی بساط ہمیشہ کے لئے الٹ گئی۔ اس وقت میرا مقصود مغلیہ عروج وزوال کی تاریخ پیش کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اسباب زوال کیا تھا؟ اور ان کا آغاز کب ہوا۔ اورنگ زیب کے انتقال (1707ء) کے بعد سے محمد شاہ کی تخت نشینی (1719ء) تک حکومت مغلیہ سخت انتشار واضطراب میں مبتلا رہی۔ شہزادوں کی باہمی خوں ریزیاں، وزراء کی سازشیں، سید برادران کا مستبدانہ اقتدار، ایسٹ انڈیا کمپنی کی چالیں، مرہٹوں کا زور، ان سب نے مل کر بارہ سال کے اندر حکومت آل تیمور کی چولیں ہلا دیں۔ خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس کا مداوا نہ ہو سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ اسی زمانے میں ''طاؤس ورباب'' کا بھی دخل دربار میں ہو گیا اور حکومت کے ساتھ عقل و ہوش کا بھی سودا ہو گیا۔ اورنگ زیب کے بعد اس کا بیٹا محمد معظم (بہادر شاہ) تخت نشین ہوا اور پانچ سال تک سخت آپا دھاپی میں مبتلا رہا۔ ظاہر ہے کہ اس دور اضطراب میں عیش وعشرت کا سوال کوئی معنی نہ رکھتا تھا لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب اس کا بیٹا جہاندار تخت نشین ہوا تو اس نے انحطاط عمر کے باوجود صرف 9 ماہ کی حکومت میں اورنگ زیب کی تمام روایات زہد وتقویٰ کو یک لخت خاک میں ملا دیا اور بادہ نوشی وشاہد پرستی کی وہ روایات اپنے بعد چھوڑ گیا جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے۔ جس حد تک حکومت کے نظم وانصرام کا تعلق تھا وہ تو اس نے اپنے وزیر ذوالفقار خاں کے سپرد کر دیا اور جس حد تک اس کی ذات، اس کے دربار، اور اس کے مشاغل زندگی کا تعلق تھا وہ صرف لال کنور کی آغوش تک محدود تھے۔ یا ان مجالس بادہ نوشی تک جو اس کی غایت زندگی ہو کر رہ گئے تھے۔ لال کنور ایک کسبی کی لڑکی تھی۔ بڑی خوش رو، بڑی خوش گلو، اور حد درجہ چنچل جس کا تعارف اس کی ماں شیریں لقا کے نام سے کیا کرتی تھی۔ لال کنور کا گھر مرکز تھا تمام شہزادوں اور امراء زادوں کا اور لال کنور کے مصنوعی التفات نے سبھی کو دیوانہ بنا رکھا تھا لیکن اسکی ماں کا مقصود تو ایسا شکار ڈھونڈھنا تھا جو سب سے زیادہ فربہ نظر آئے۔ اس لئے ان تماشبینوں میں اس نے جہاں بخت کا انتخاب کیا جو جہاندار شاہ کا ماموں زاد بھائی بھی تھا اور

فی الجملہ طرحدار بھی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دوسرے عشاق کو جواب دے دیا گیا اور لال کنور، جہاں بخت کی مستقل داشتہ ہوگئی۔ اس کے بعد جہاندار شاہ نے لال کنور کے حسن و جمال کا ذکر سنا تو وہ غائبانہ عاشق ہوگیا اور اس کے حوارئین نے لال کنور کی ماں سے گفت وشنید شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس زریں موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتی اس لئے اس نے ایک کثیر رقم پر سودا کر لیا اور لال کنور ایک رات خفیہ طور پر محل کے اندر پہنچا دی گئی۔ جہاں بخت بھی معمولاً رات ہی کو آیا کرتا تھا اس نے اس سے آتے ہی پوچھا کہ لال کنور کہاں ہے۔ اس کی ماں جس نے پہلے ہی سے سب تدابیر پر غور کر لیا تھا۔ حد درجہ سوگوارانہ انداز میں زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ ''وہ تو کل ہی درد قولنج میں مبتلا ہو کر دفعتاً مر گئی اور شاہ نظام الدین میں دفن کر دی گئی۔'' جواں بخت جسے پہلے ہی تمام حالات معلوم ہو چکے تھے بپھر گیا اور بولا کہ تو جھوٹ بولتی ہے۔ لال کنور کو تو نے محل پر بھیج دیا ہے اور مجھ سے یوں باتیں بناتی ہے۔''

اس نے قسمیں کھانا شروع کیں۔ اور جہاں بخت کا غصہ بھی اسی نسبت سے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے پیش قبض نکال کر اسے قتل کر دیا۔ یہ بات ایسی نہ تھی کہ چھپی رہتی۔ آناً فاناً شہر کے کونہ کونہ میں خبر پہنچ گئی اور لال کنور نے روتے روتے برا حال کر لیا۔ جہاندار شاہ کو صدمہ لال کنور کی ماں کے قتل ہونے کا نہ تھا بلکہ صرف اس بات کا کہ وہ لال کنور کو سوگوار نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ خود بے دست و پا تھا اور ذوالفقار خاں وزیر پر اس کا قابو نہ تھا۔ اس لئے جہاں بخت کے خلاف قانونی چارہ جوئی یا گیرودار مناسب نہ سمجھی۔ لیکن چند دن بعد جہاں بخت کو بھلاوے میں ڈال کر زہر سے ہلاک کرا دیا۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ کی زندگی کا مشغلہ اس کے سوا کچھ نہ رہا کہ وہ ہر وقت نشۂ شراب میں بدمست لال کنور کی آغوش میں پڑا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دربار پر ڈوم ڈھاری چھا گئے اور لال کنور کے اعزہ کا عروج شروع ہوا یہاں تک کہ اسے امتیاز محل کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور اس کے ایک بھائی خوشحال خاں کو ہفت ہزاری امیر بنا دیا گیا اور دوسرے بھائی کو پنج ہزاری۔ لال کنور کے اقتدار و عروج کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جسے مصنف تذکرۂ عالم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''ایک دن جہاندار شاہ اپنا سر شیریں لقا کے زانو پر رکھے پڑا تھا۔ اس کی جوانی کی سرخی، شراب ارغوانی کی جھلک، چاروں طرف پھولوں کے ڈھیر، عطر کی لپٹیں! اسی عالم سرور و نشاط میں، شیریں لقا نے جہاں دار شاہ سے عرض کیا کہ یوں تو جہاں پناہ کی تمام نوازشیں مجھے حاصل ہیں لیکن دو وعدے اب تک پورے نہیں ہوئے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ وعدے کیا ہیں مجھے بتاؤ میں ابھی ان کو پورا کروں گا۔ اس نے کہا ایک وعدہ تو یہ تھا کہ شاہی سکہ میں میرا نام درج کیا جائے گا اور دوسرے یہ کہ تمام شہزادوں کی آنکھیں نکلوالی جائیں گی۔ یہ سن کر جہاندار شاہ نے اسی وقت جلاد کو بلایا اور راتوں رات شہزادوں کی آنکھیں نکلوا دیں۔ جہاندار شاہ کی گیارہ بارہ بیگمیں تھیں، لیکن انہی میں ایک شریف راجپوتنی بھی تھی، سردار جے سنگھ کی بیٹی، جو پہلے نائب خزانچی تھا اور پھر پنج ہزاری امیر ہو گیا تھا۔ اس بیگم کا نام انوپ بائی تھا۔ اور لقب فخر النسا۔ چونکہ یہ ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی اور اسے شیریں لقا کی بے حیائیاں پسند نہ تھیں۔ اس لئے ایک رات اس نے جہاں دار شاہ اور اس کی محبوبہ پر دھاوا بول دیا اور ٹھیک اس وقت جب دونوں نشۂ شراب میں سرشار تھے تلوار کھینچ کر ان کے سروں پر پہنچ گئی۔ جہاں دار شاہ گھبرا گیا اور

پوچھا یہ کیا قصہ ہے اس نے کہا قصہ صرف یہ ہے کہ آپ اس کسبی کو محل سے نکال دیں ورنہ میں اسے زندہ نہ رہنے دوں گی۔ بادشاہ نے ڈر سے وعدہ کر لیا لیکن انوپ بائی نے کہا کہ آپ کے وعدہ کا اعتبار نہیں۔ مجھے تو اس کی ناک کاٹ کر اتنا بدصورت بنا دینا ہے کہ آپ اس کی طرف مائل ہی نہ ہوں۔ جہاں دار شاہ نے کہا کہ میں یہ بات ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ لیکن انوپ بائی تہیہ کر چکی تھی۔ اس لئے اس نے آگے بڑھ کر لال کنور کی چوٹی پکڑی اور اسے زمین پر گرا کر اس کی ناک کاٹ لی۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے بعد انوپ بائی محل میں نہ رہ سکتی تھی۔ اس لئے محل سے نکل کر اپنے باپ جے سنگھ کے پاس پہنچی اور اس سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس کے بعد دونوں فرخ سیر کے پاس چلے گئے۔ جہاں دار شاہ کی ایک اور بیگم مہر النساء بھی تھی۔ یہ ایک لونڈی تھی کردنسل کی جسے دس ہزار میں خریدا گیا تھا۔ ایک دن اپنی دادی کی دعوت میں وہ کھانا کھا رہا تھا اور یہ کنیز مور چھل جھل رہی تھی کہ دفعتاً جہاں دار شاہ کی نگاہ اس پر پڑ گئی اور کھانے کے بعد ہی محافہ میں سوار کرا کے محل میں پہنچا دی گئی۔ چونکہ کرد خاندان کی لڑکی تھی اس لئے جہاں دار شاہ کے اطوار دیکھ کر اس سے بدظن ہو گئی اور اس نے ذوالفقار خاں وزیر سے ساز باز کر کے جہاں دار شاہ کو معزول کرا دینا چاہا۔ اتفاق سے اس کا علم جہاں دار شاہ کو بھی ہو گیا۔ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کا سر کاٹ کر پیش کیا جائے۔ لیکن جب جلاد اس کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ پہلے ہی اپنے گلے میں رسی ڈال کر ختم ہو چکی ہے۔ یہ تھا رنگ جہاں دار شاہ کی حکومت کا جس نے سب سے پہلے اپنے مغلیہ خاندان میں شراب خوری اور فحاشی کو رائج کیا اور صرف ۹ مہینے حکومت کرنے کے بعد اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھ سے وہ قتل ہوا۔ جہاں دار شاہ کی رنگ رلیوں کی داستان آپ سن چکے لیکن یہ بدعت اس کے بعد بھی بدستور جاری رہی اور بڑھتے بڑھتے محمد شاہ کے زمانہ میں انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ جب جہاندار شاہ کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا فرخ سیر تخت نشین ہوا تو ملک کی اندرونی حالت بہت خراب تھی اور تمام وہ فتنے جو اس سے پہلے رونما ہو چکے تھے پورے شباب پر پہنچ گئے تھے امراء کی باہمی رقابت و سازش۔ سکھوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار، سید برادران کی چالیں، یہ سب مل کر حکومت کو تباہ کرتی جا رہی تھیں۔ لیکن فرخ سیر کو مطلق اس کا احساس نہ تھا۔ جہاندار نے جس انداز زندگی کا آغاز کیا تھا وہی بدستور عہد فرخ سیر میں بھی جاری رہی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ وہ ۳۰ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ چھ سال ۴ ماہ حکومت کی۔ اور فروری ۱۷۱۹ء میں سید حسین علی خاں نے اسے قتل کر دیا۔ اس دردناک واقعہ کا ذکر حسن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ ''جب شہر میں وزیر قطب الملک کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو سید حسین علی خاں نے فیصلہ کر لیا کہ اب فرخ سیر کو ختم ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ نجم الدین خاں (قطب الملک کا بھائی) بہ جبر محل شاہی میں داخل ہوا اور عورتوں کو مار پیٹ کر معلوم کیا کہ بادشاہ کہاں چھپا ہے۔ اس وقت محل میں کہرام برپا تھا۔ عورتیں زار و قطار رو رہی تھیں، سینہ کوٹ رہی تھیں، لیکن سننے والا کوئی نہ تھا۔ بادشاہ کو پکڑ کر حجرہ سے باہر لے آئے اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں اور اس کے بعد ترپولیہ کی ایک تنگ کوٹھڑی میں اسے قید کر دیا اور گردن میں تسمہ ڈال کر نہایت بے دردی سے گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔ فرخ سیر کے زمانے میں ملک جس اضطراب و انتشار کا شکار تھا اس کی داستان بہت طویل ہے۔ لیکن اس وقت ہمارا مقصود اس عہد کے تاریخی و سیاسی حالات پر روشنی ڈالنا نہیں ہے۔ اس لئے

اس سے قطع نظر صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ رندی وعیاشی کی وہ زندگی جس کا آغاز جہاندار شاہ نے کیا تھا فرخ سیر کا بھی معمول رہی۔ اور آخر کار شاہد وشراب کی رفاقت نے اس کی بھی جان لی۔ فرخ سیر کی بھی کئی بیگمیں تھیں۔

(1) شانتی کماری، راجہ اجیت سنگھ والیٔ مارواڑ کی بیٹی جسے گیتی آرا بیگم کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ یہ شادی خود راجہ کی تحریک وخواہش کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ اس طرح وہ فرخ سیر کو خوش کر کے اپنے رجواڑے کا وہ حصہ جو حکومت دہلی میں شامل ہو گیا تھا واپس لینا چاہتا تھا اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس شادی میں فرخ سیر نے بے دریغ دولت صرف کی جس کا حکومت کے مالیات پر بہت برا اثر پڑا۔ اور عبداللہ خان کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی۔ لیکن خود شانتی کماری اپنی جگہ بڑی باعزت اور ہوش و گوش والی عورت تھی۔ اس کے ساتھ وہ غیر معمولی حسین بھی تھی۔ سنسکرت اور ہندی ادبیات پر بھی اسے بڑا عبور تھا اور اسی حد تک شجاع و دلیر بھی تھی۔ شادی کے بعد فرخ سیر اس کا غلام ہو گیا اور اس کے عشق میں ساری دنیا کو بھول کر مے خواری اس کا شب و روز کا مشغلہ ہو گیا۔ شانتی کماری نے بہت کوشش کی کہ وہ لہو ولعب اور رقص وسرود سے ہٹ کر امور سلطنت کی طرف بھی متوجہ ہو۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور سید برادران کا اقتدار برابر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن جب کہ وہ نشہ شراب میں بدمست تھا انہوں نے محل کو گھیر لیا اور مقابلہ شروع ہوا۔ فرخ سیر کو کیا ہوش تھا کہ وہ سامنے آتا۔ لیکن شانتی کماری نے البتہ ڈٹ کر مقابلہ کیا اور فرخ سیر پر نثار ہو گئی۔

(2) احمد النساء بیگم۔ یہ عبداللہ خاں کی بھانجی تھی اور بڑی شائستہ اطوار خاتون تھی۔ عبداللہ خان نے یہ شادی اس لئے کر دی تھی کہ ممکن ہے بادشاہ سنبھل جائے اور اس کے مشاغل لہو ولعب کم ہو جائیں، لیکن یہاں تو ادبار کا بھوت سر پر سوار تھا۔ احمد النساء بیگم جتنا سمجھاتی وہ اتنی ہی اس کی مخالفت کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اس سے بیزار ہو گیا اور عبداللہ خان کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنی بھانجی کو بلا لے ورنہ میں اس کو قتل کر دوں گا۔ اس کے ساتھ اس نے احمد النساء بیگم کو محل سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور اس نے اس بے عزتی کو گوارا نہ کر کے خودکشی کر لی۔

(3) گوہر۔ یہ ایک معمولی سپاہی عظمت خاں کی بیوی تھی، جس کو دیکھ کر فرخ سیر فریفتہ ہو گیا اور عظمت خان کو حکم دیا کہ اسے طلاق دے دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ کے حکم سے سرتابی بجائے خود ایک بڑا جرم تھا۔ اس لئے اس کو بند کر دیا گیا اور گوہر کو بہ جبر محل میں داخل کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے جب بدنامی زیادہ بڑھی تو عبداللہ خان کی سفارش پر عظمت خاں کو تو چھوڑ دیا لیکن اس کی بیوی بدستور محل کے اندر ہی رہی اور اس وقت تک اپنے اصلی شوہر سے نہ مل سکی، جب تک فرخ سیر قتل نہیں ہو گیا۔

(4) فرخ سیر کی وہ بیگم جس نے اسے بالکل تباہ کر دیا۔ یہ ایک بازاری عورت تھی جو غیر معمولی حسین ہونے کے علاوہ رقص ونغمہ کی بھی بڑی ماہر تھی۔ بڑے بڑے امراء کے ہاں اس کا ناچ مجرا ہوا کرتا تھا۔ فرخ سیر کو جب اس کا علم ہوا تو محل میں طلب کیا اور کئی دن تک شراب میں مست ناچ رنگ دیکھتا رہا۔ فرخ سیر نے اس سے محل میں آ کر رہنے کو کہا اس نے انکار کر دیا اور بولی کہ میں کسی کی پابند ہو کر نہیں رہ سکتی۔ لیکن یوں جب بھی مجھے یاد کیا جائے گا، حاضر ہو جاؤں گی۔ اس طرح محل میں اس کا آنا جانا شروع ہوا اور فرخ سیر کی فریفتگی بڑھتی رہی۔ اس عورت کا منظور نظر ایک حبشی غلام

تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے عالم سرمستی میں اپنا نولکھا ہار اس غلام کو دے دیا لیکن جب وہ اسے فروخت کرنے کے لئے بازار گیا تو پکڑا گیا اور اس کسبی کی گرفتاری کا حکم کوتوال نے دے دیا۔ یہ گھبرا کر محل میں آ گئی اور ایک مہینے تک یہیں رہی۔ بادشاہ نے حبشی غلام کو بھی رہا کرا دیا اور وہ بھی محل میں آنے جانے لگا۔ ایک رات جب کہ بادشاہ غافل و مدہوش تھا وہ اپنے غلام کے ساتھ محل سے بھاگ گئی اور پھر پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں غائب ہوگئی۔ بادشاہ کو اس کی مفارقت کا اتنا صدمہ ہوا کہ کھانا پینا ترک کر دیا لیکن چند دن بعد پھر وہی رنگ رلیاں شروع ہوگئیں۔ فرخ سیر کے بعد سید برادران نے دو شہزادے یکے بعد دیگرے تخت نشین کئے لیکن یہ تخت نشینی برائے نام تھی۔ سارا اختیار سید برادران کے ہاتھ میں تھا۔ ان میں ایک شہزادے کا نام رفیع الدرجات تھا۔ دوسرے کا نام رفیع الدولہ۔ رفیع الدرجات' بہادر شاہ کا پوتا تھا اور تخت نشینی کے وقت اس کی عمر 20 سال کی تھی۔ لیکن حرم کی عیاشانہ زندگی اور کثرت مے خواری کی وجہ سے وہ عرصہ سے سل کے مرض میں مبتلا چلا آ رہا تھا۔ اس لئے تخت نشینی کے چار ماہ بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا چھوٹا بھائی رفیع الدولہ جانشین ہوا اور تین ماہ بعد پندرہ سال کی عمر میں یہ بھی مر گیا۔ یہ حضرت 13 سال کے بھی نہ تھے کہ سات آٹھ بیگموں کے شوہر ہو چکے تھے۔ جن میں سرہندی بیگم اور فتحپوری بیگم بھی تھیں۔ فتحپوری بیگم سے عالم شیر خوارگی ہی میں شادی ہو چکی تھی اور سرہندی بیگم سے بارہ سال کی عمر میں۔ اس کا مشغلہ زندگی بھی مے خواری اور رقص و سرود کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ وہی محمد جس کے زمانہ میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تاراج کیا۔ جس نے 30 سال حکومت کی اور اتنا جی کھول کر داد عیش دی کہ رنگیلے کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ دستور تھا کہ جب کوئی تاجر دہلی آتا تو بادشاہ کے حضور میں اشرفیوں کی نذر پیش کرتا۔ لیکن محمد شاہ کے عہد میں اشرفیوں کی جگہ خوبصورت لونڈیاں پیش ہونے لگیں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک تاجر آیا اور کسی گوجر کی ایک لڑکی اپنے ساتھ لایا جس کے حسن کی سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ بادشاہ نے دیکھا تو وہ اس قدر فریفتہ ہوئے کہ ایک لاکھ اشرفی میں اسے مول لے لیا۔ اور ساری دنیا کو بھول گئے۔ اس لڑکی کا اقتدار اتنا بڑھا کہ ممکن نہ تھا کہ کوئی فرمائش کرے اور پوری نہ ہو۔ ایک مرتبہ اس نے گرمی کے زمانے میں لال قلعہ سے قطب صاحب جانے کا فیصلہ کیا تو یہاں سے وہاں تک دو رویہ خس کی ٹٹیاں لگائی گئیں۔ فوارے نصب کئے گئے۔ رومی مخمل کا فرش بچھایا گیا۔ اور عطر کا چھڑکاؤ ہوا جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ محمد شاہ کس درجہ عیش پسند انسان تھا اور مسلسل 30 سال تک اس نے کتنی دولت ان عیاشیوں میں صرف کی ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

طلوع اسلام: یہ مختصر سا مضمون بڑا معلومات افزا اور عبرت انگیز ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک نکتہ ایسا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارباب اقتدار کی عیش پرستیاں حکومت کے زوال کا باعث ہوتی ہیں لیکن کسی سلطنت کے زوال اور سقوط کا یہی واحد سبب نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بنیادی سبب بھی نہیں ہوتا۔ سلطنت کی بقا اور فنا کا بنیادی طور پر دارومدار اس نظام پر ہوتا ہے جس کے مطابق وہ سلطنت قائم ہوتی اور اپنا کاروبار چلاتی ہے۔ اگر وہ نظام باطل کی بنیادوں پر استوار ہے تو وہ سلطنت کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ خواہ اس کے چلانے والے ذاتی طور پر کتنے ہی نیکوکار

اور پاکباز کیوں نہ ہوں۔ دنیا میں بدترین نظام حکومت' ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ ملوکیت کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان (یا دور حاضرہ میں' ''چہرہ'' کی تبدیلی سے' انسانوں کی کوئی جماعت) دوسرے انسانوں پر اپنا حکم چلائے اور پھر یہ اقتدار بغیر جوہر ذاتی کے آگے منتقل ہوتا چلا جائے۔ ملوکیت کے نظام کی بنیاد میں (بقول غالبؔ) خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے جو اسے تباہی سے بچا نہیں سکتی۔ تاریخ تہذیب کا مشہور مورخ برفا (Briffault) اپنی کتاب (The Making of Humanity) میں سلطنت روما کے زوال پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے:

انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام باطل کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری' خارجی نظم وضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت' عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے ''سوداگری'' کو نہایت قابلیت اور تدبر' خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن حسن انتظام کی یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رورعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔ (ص:159)

ہماری کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ہم اپنی تاریخ میں نظام تمدن ومعیشت و سیاست کو نہیں دیکھتے اور پرکھتے۔ بلکہ ہماری نگاہیں افراد تک پہنچ کر رک جاتی ہیں۔ اگر کوئی بادشاہ نمازی اور پرہیزگار رہے تو ہم اس کی حکومت کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں۔ اگر اس میں ذاتی خرابیاں ہیں تو ہم اس کی سلطنت کو ہدف طعن وتشنیع قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ باطل کی بنیادوں پر متفرع نظام کبھی مستحق تبریک وستائش نہیں ہو سکتا خواہ اس کے ارباب حل وعقد ذاتی طور پر کتنے ہی نیک اور پاکباز کیوں نہ ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارباب حکومت کا ذاتی کیریکٹر بڑا بلند ہونا چاہئے لیکن ان کی ذاتی نیکیاں' باطل کے نظام کی خرابیوں کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔ سلطنت مغلیہ کی تباہی کا باعث اورنگ زیب کے بعد کے حکمرانوں کی عیش سامانیاں ہی نہ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ خود ملوکیت کی بنیادی خرابی تھی۔ اس سے پہلے حکمرانوں کے حسن تدبر نے اسے سہارا دئے رکھا لیکن ملوکیت کی خرابیوں کا وزن بڑھتا چلا گیا اور بال آخر یہ عمارت خود اپنے بوجھ سے نیچے آ گری۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ (مثلاً) اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے بعد جو کچھ کیا تھا اس سے اس سلطنت کی تباہی کے اسباب میں اضافہ نہیں ہوا تھا اور کیا اس کا نماز' روزہ ان خرابیوں کا کفارہ بن سکتا تھا؟ اس کے زمانے ہی میں وہ عمارت گر رہی تھی۔ اس کے جانشینوں کی عیش پرستیوں نے' یوں کہئے کہ اس کی مدت حیات کو ختم کرنے میں ذرا جلدی کر دی۔ اور اصل تو یہ ہے کہ ذرا گہرائی میں جانے سے یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ ان کے کیریکٹر کی یہ خرابیاں بھی بیشتر اسی نظام ملوکیت کی پیدا کردہ تھیں۔ قرآن کریم نے کسی نظام کے بقا اور دوام کے لئے ایک ہی اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ: مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ (13:17) جو نظام عالم انسانیت کے لئے نفع بخش ہوگا اسی میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوگی۔ لہٰذا ''یَنْفَعُ النَّاسَ'' نظام اور اس نظام کے چلانے والوں کا حسن کردار دونوں مل کر مملکت کی بقا کا موجب بنتے ہیں۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قانون سے استثناء

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے لیے رزق اور ہدایت کی فراہمی اپنے اوپر لی ہے۔(87:3،11:1)اس طرح انسانوں کی طبعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں، اور انسانیت کی ہدایت بھی ہوتی رہی۔ اسی وجہ سے شروع دن سے ہی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ جاری کیا اور بعثت انبیاء کے اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر ایک احسان فرمایا ہے (3:164) ہر نبیؑ کے ساتھ ہدایت کا ایک آئین ودستور آتا تھا۔ ہر نبیؑ اس آئین ودستور کے مطابق ایک نظام قائم کرتا تھا۔ نبیؑ کے انتقال کے بعد اس کی وحی میں آمیزش ہوجاتی تھی، اور وہ نظام درہم برہم ہوجاتا تھا تو ایک نیا نبی اپنی وحی کے ساتھ مبعوث ہوتا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ، اپنی وحی منزہ شکل میں پھر عطا کر دیتا تھا۔ شروع میں معاشرے سادہ ہوتے تھے۔ اس لئے اس نبی کی وحی میں اصول وجزئیات دونوں ہوتی تھیں۔ جوں جوں معاشرے ترقی کرتے گئے اصول زیادہ ہوتے گئے اور جزئیات کم ہوتی گئیں۔ جب انسانیت بالغ ہوگئی تو وہ کتاب عطا کی گئی جس میں اصول زیادہ تھے اور جزئیات ہر زمانہ کے معاشرے کے لیے چھوڑ دی گئیں، کہ ہر معاشرہ اپنی ضروریات کے مطابق جزئیات مقرر کرتا چلا جائے۔

یہ انبیاء کرامؑ صرف زبانی وعظ وتقریر نہیں کرتے تھے وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ (2:213) انہیں ضابطہ قانون دیا جاتا تھا جو حق پر مبنی ہوتا تھا۔ حکومتیں وہ بھی ہوتی ہیں جن میں انسانوں کا وضع کردہ قانون جاری ہوتا ہے۔ لیکن اس حکومت میں وہ قانون رائج ہوتا تھا جو حق پر مبنی ہوتا تھا۔ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ؕ وَمَا اخۡتَلَفَ فِيۡهِ (2:213) وہ کتاب لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خود قانون سازی کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ہمیشہ ہر حکومت میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین انبیاء کرامؑ نے جاری فرمائے۔

سورۃ الحدید میں ارشادِ عالی ہے لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ (57:25) ہم نے اپنے رسول نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ سیدھے انصاف پر رہیں۔ اس آیت میں بھی وہی بات دہرائی گئی ہے کہ انسانوں کے درمیان اختلافی معاملات کا فیصلہ نبی کی کتاب کے ذریعے ہوتا تھا، اور انسان خود قانون وضع نہیں کرتے تھے۔

سورہ مائدہ میں ارشاد ہے۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ

هَادُوْا (5:44) ترجمہ: بے شک ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیاءؑ ربانی علماء وفقہاء یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ اس مقام پر تورات کی منزلت اور رفعت شان بیان کی گئی ہے کہ اس تورات کے سچے اور مخلص حاملین کی یہ روش رہی ہے کہ اللہ کے فرمانبردار نبی اس کے قوانین واحکام کے مطابق معاملات اور مقدمات کے فیصلے کرتے رہے تھے۔ اس آیت میں جو یَحْکُمُ کا لفظ آیا ہے اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب اللہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے معاملات اور تنازعات میں امر وحکم اور فیصلہ وقضا کا ذریعہ بنے اور تمام سیاسی وقانونی معاملات اس کے احکامات کے مطابق طے پائیں لیکن اگر اس کتاب کے مطابق زندگی کے مسائل کا فیصلہ نہ ہو، تو نہ صرف یہ کہ اس کتاب کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا بلکہ اگر اس کے احکام کے خلاف احکام بنائے جائیں تو یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے اور اس کی بے حد بے عزتی ہے۔

جس طرح تمام سابقہ انبیاء کرامؑ کو قانون سازی کا حق نہیں تھا اور وہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اسی طرح حضور ﷺ کو بھی قانون سازی کی اجازت نہیں تھی اور آپ کو بھی یہی حکم ہوا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) ترجمہ: جو اللہ نے اتارا ہے تو آپ بھی اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ حضور ﷺ کو یہی حکم دوبارہ دیا گیا کہ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (5:49) ترجمہ: ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے کرو اور ان کی خواہشات پر نہ چلو۔ خود حضور ﷺ کا اپنا قول گرامی تھا مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآيِ نَفْسِيْ ۚ (10:15) ترجمہ: میرا یہ کام نہیں کہ اس (قانون) کو اپنی طرف سے بدل دوں۔

ہم نے یہ پانچ آیاتِ کریمات یہ بات ثابت کرنے کے لئے تحریر کی ہیں کہ قرآنِ کریم انسانوں کو حتیٰ کہ خود رسولوں کو بمع حضور ﷺ کے قانون سازی کی اجازت نہیں دیتا لیکن یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ عقل انسانی خیر وشر میں امتیاز نہیں کرسکتی قرآنِ کریم نے یہ ایک چیلنج دیا ہے اور اس کا یہ چیلنج برقرار ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (2:216) ترجمہ: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اسی میں تمہاری بھلائی ہو، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم جس چیز کو پسند کرتے ہو، اس میں تمہاری برائی ہو اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو قانون سازی کا حق کیوں نہیں دیا اس کی دوسری وجہ سورۂ مائدہ میں بیان فرمائی گئی ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (5:44) ترجمہ: جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ہے۔ اس سے اگلی آیات میں انہیں ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق انسانوں کے وضع کردہ قوانین کفر، ظلم، اور فسق پر مبنی ہوتے ہیں جب بھی کوئی انسان کوئی قانون بناتا ہے اس میں کفر، ظلم اور فسق پایا جاتا ہے۔ محترم المقام جناب مولانا مودودی مرحوم نے ان آیات کی عقلی توجیہہ کی ہے جو بہت عمدہ ہے۔ آپ اس توجیہہ کو ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اقتباس ذرا لمبا ہے ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ لیکن بہت توجہ کے قابل ہے۔

''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے۔ وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اوّلاً اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا۔ اس نے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہوکر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی کے دائرے سے باہر قدم نکالا، اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم، اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہوگیا۔''

قرآنِ کریم انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو سند نہیں کرتا وہ اس قانون کو recognize ہی نہیں کرتا۔ جب وہ حکم دیتا ہے کہ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (5:8) تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق عدل کیا جائے۔ قرآنِ کریم ایسی حکومت کے قیام کو ہر شخص پر فرض قرار دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق عدل کیا جائے۔ قرآنِ کریم کے مطابق نہ صرف اقامت دین فرض ہے بلکہ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:123) ہمارا ایک مضمون موقر رسالہ طلوع اسلام میں طبع ہوا تھا ہم نے اقامت دین کی فرضیت کے متعلق اس میں تحریر کیا تھا:

''مومن وہ ہے جو قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظامِ الٰہی کے قیام کے لیے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی موجود ہو۔ وہیں اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظامِ الٰہی کسی خاص مقام یا کسی خاص دور سے مختص نہیں اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام نظام ہائے باطل کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے اور جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں اُن کے لیے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں جو لوگ اللہ ورسول کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں، وہ اللہ ورسول کے باغی اور نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز وروزہ کے پابند ہوں غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:23) اور غیر اسلامی نظام میں جس قدر رزق حاصل ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہوتا ہے، اور اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہے۔ موقر رسالہ ترجمان القرآن بابت دسمبر 2011ء میں ایک مضمون اقامتِ دین فرض ہے'' طبع ہوا تھا۔ یہ مضمون بہت عمدہ ہے اور اپنے عنوان کی نسبت سے اس درجہ عمدہ ہے کہ آنکھوں کو لگانے کو دل چاہتا ہے۔ اس موضوع پر اس کے تین اقتباسات پیش خدمت عالی ہیں۔

''اقامتِ دین تمام فقہائے اسلام کے نزدیک متفقہ اور مسلمہ فریضہ ہے۔ اس میں اختلاف اور تفرقہ حرام ہے۔ جس طرح دین کی تبلیغ ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داریاں ہم نے ازخود نہیں لیں بلکہ ربّ کائنات جس نے ہمیں عدم سے وجود بخشا وہ ہمارا مالک وحقیقی ولی ہے۔ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ انسانی پیدائش کا مقصد بتائے اور اس کے لیے ضابطہ وقانون بتائے۔ اس نے ہمیں انبیاءؑ کا وارث قرار دیا ہے۔ اس نے انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد اقامت دین قرار دیا ہے۔ حضور ﷺ کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ فریضہ امت مسلمہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس طرح ازخود اقامتِ دین ہماری زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ مقصد زندگی قرار دینے کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے مقصد زندگی کا صحیح شعور حاصل کریں اور اس کے مطابق اپنے اندر مطلوبہ اخلاق، اوصاف اور استعداد پیدا کریں۔''

2۔ ایسے تمام نصوص قرآنی سے بطورِ اقتضا، اسلامی حکومت کے قیام کی فرضیت ثابت ہوتی ہے اور مسلم معاشرے کے تمام افراد پر اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرنا بحد استطاعت فرض ہے اور استطاعت کے باوجود اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا ویسے ہی گناہ ہے جیسے صاحبِ استطاعت مسلمان پر روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج، فرض ہے اور ان فرائض کو ترک کرنا عاقبت کو برباد کرنا ہے۔

3۔ حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے، تو اس کی اطاعت فرض ہے اور اگر ایسی حکومت نہیں ہے تو اس کی اطاعت جرم ہے۔

ان چار اقتباسات سے آپ کو اقامتِ دین کی فرضیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

سورۃ الانعام میں ارشادِ عالی ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ (6:123) ترجمہ: اور ہم نے اسی طرح ہر بستی میں گنہگاروں کے سردار کئے کہ فریب کیا کریں اور جو حیلے یہ کرتے ہیں وہ اپنی جان پر کرتے ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں۔ قرآنِ کریم قوموں کے تباہ ہونے کا سبب بیان کرتا ہے کہ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والا ہر شخص مجرم ہوتا ہے، البتہ ان کے لیڈر ''اکبر المجرمین'' یعنی مجرموں کے سردار ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم ان معاشروں کی قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلی کے ممبران وزراء، مشیر سب کو اکابر مجرمین، یعنی مجرموں کا سردار کہتا ہے۔ ان غیر اسلامی معاشروں کے متعلق فرمایا ان کے ہاں ایک تو عام مجرم ہوتے ہیں، ایک اکابر مجرمین ہوتے ہیں یعنی مجرموں کے سرغنے یعنی بڑے بڑے مجرم لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ پھر اپنے اعمال مزین بن کر ان کو دکھائی دیتے ہیں۔ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ (6:122) وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اگر ایک مرتبہ وزیر یا وزیر اعظم بن گئے تو اس کرسی کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔

اسلامی مملکت کا آئین قرآنِ کریم ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے دور میں یہی آئین تھا اور حضور ﷺ اس آئین کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے آئین غیر اسلامی مملکت میں جاری ہوتے ہیں۔ قرآن کے مطابق انسانوں کے بنائے ہوئے آئین کی ایک ایک شق، اس کا ایک ایک آرٹیکل کفر، ظلم اور فسق پر مبنی ہوتا ہے۔ اس آئین کے متعلق قرآن فرماتا ہے مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (7:71) ترجمہ: اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نہیں اتاری۔ ہم خود ہی اپنے نظام

بناتے ہیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ ہمارے نزدیک مقدس بن جاتا ہے۔لیکن حقیقت میں وہ مقدس نہیں ہوتا انسان، انسان سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت و برتری نہیں ہے۔ایک انسان کی بنائی ہوئی کوئی چیز دوسرے انسان کے لیے مقدس نہیں ہوسکتی۔قرآنِ کریم کے نزدیک تقدس کا صرف ایک معیار ہوتا ہے اور وہ ہے مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۔۔۔اس کے تقدس کے لیے اللہ نے کوئی سند اتاری ہو۔قرآنِ کریم نے یہ بات واضح فرمادی کہ کسی چیز کی قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو منزل من اللہ ہے۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھنا ضروری ہے۔دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے صرف ایک ہی ہے یعنی ماانزل اللہ جو اللہ نے نازل کی۔

غیر اسلامی نظام اور انسانوں کے وضع کردہ آئین اور اس نظام کے اکابرین کی جو اصل حقیقت ہے وہ آپ کے سامنے پیش کردی گئی ہے۔اس کے بعد اس آئین سے استثناء کے متعلق معلوم کرنا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ایک نظام ہی باطل ہے۔دوسرے، معصیت الٰہی پر قائم ہے۔اس میں استثناء حاصل کرنا بھی باطل ہے۔حرام کی کمائی کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔ البتہ اسلامی آئین یعنی قرآنِ کریم کے مطابق کسی شخص کو قانون سے استثناء حاصل نہیں ہوسکتا۔اسلامی مملکت میں سب سے بڑا مرتبہ اور مقام حضور ﷺ کا ہے۔حضور نے اپنی ذمہ داری کے متعلق فرمایا: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ (6:50) ترجمہ: میں تو ان ہی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے ایک اور مقام پر ارشاد عالی ہے اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝(10:15) میں تو ان ہی احکام کی ہمسری کرتا ہُوں جو میری طرف وحی کئے جاتے ہیں، مجھے اندیشہ ہے بڑے دن کے عذاب کا اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں۔

اصل یہ ہے کہ اسلامی مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی اس کے احکامات کی اطاعت سے تزکیہ نفس ہوتا ہے(2:286) صفاتِ خداوندی کا یہ تقاضہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے اور معاشرہ میں ان کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے اللہ تعالیٰ ربّ ہے۔ کائنات اور کائنات میں رہنے والے ہر فرد کی ربوبیت کرتا ہے اس کی اس صفت کا یہ تقاضہ ہے کہ اس کی اس صفت کو خوب فروغ دیا جائے۔اس نے انسان کو پیدا ہی اس لئے کیا کہ اس کی صفات پر عمل کیا جائے۔اسلامی مملکت کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت صفاتِ خداوندی کو رائج کرتی ہے۔اس وقت ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات عالیہ پر صرف ایمان لائے ہوئے ہیں۔اسلامی مملکت اس کو عملاً جاری کرتی ہے وہ صفات اسلامی مملکت کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ اس دنیا میں جلوہ گر ہوگیا ہے۔اور زمین اللہ تعالیٰ کے نور سے چمکنے لگتی ہے۔اسلامی مملکت کے حکام کو اللہ تعالیٰ نے حاملین عرش الٰہی کہا ہے۔خارجی کائنات میں جو وسائط و ذرائع نظم و نسق قائم رکھتے ہیں اور خدا کے پروگرام کے مطابق سرگرم عمل رہتے ہیں، اُنہیں ملائکہ کہا جاتا ہے لیکن جب انسانی دنیا میں حکومتِ خداوندی قائم ہوتی ہے تو جو لوگ اس حکومت کے قیام و استحکام کے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ حاملین عرش الٰہی ہوں گے(32:75)۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ پر فوائد میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے تحریر فرمایا ''اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا

رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبورِ محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اختیار پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لیے کوئی محل نہ ملتا مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم، الشدید، قائم بالقسط، مالک یوم الدین وغیرہ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے سے غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انجام کار اس کے سوا کوئی دوسری غرض نہیں بتا سکتا۔ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ (67:2) مولانا نے یہ بڑی درست بات تحریر فرمائی ہے۔

صفاتِ خداوندی کو عملاً ظہور میں لانے کے لیے اسلامی نظام کا قائم کرنا ہر شخص پر فرض ہے اور اسی سے اس کی پیدائش کا جواز پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح ہر انسان صفاتِ خداوندی کو جگہ بہ جگہ موقع بہ موقع ظہور میں لا کر، اس کائنات کو آگے سے آگے لے جاتا ہے، اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔ اس پورے عمل میں پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ صفاتِ خداوندی پر اجتماعی طور پر عمل کرنے سے یہ کائنات اگلے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں زندگی مزید ترقی کرتی چلی جائے گی۔

سانحہ ارتحال

بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی کے بنیادی رکن اور پرویز صاحب کے دیرینہ ساتھی راولپنڈی میں پہلے کنونشن کے آرگنائزر اور تحریک کے متحرک کارکن مرزا ظہور الحق اپنی زندگی کی 96 بہاریں گزار کر خلد بریں میں اپنے ساتھیوں سے ہمدوشی کا لطف اُٹھانے گزشتہ اتوار 16 اگست 2020ء کو انتقال فرما گئے۔ وہ زندگی کے آخری لمحات تک ذہنی طور پر توانا اور متحرک رہے اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے اہم واقعات سے اراکین بزم کے حوصلوں کو جلا بخشتے رہے۔

اُنہوں نے اپنی زندگی قرآن کے اعلیٰ اصولوں کے تحت گزاری اور ناداروں اور بیواؤں کے حقوق کے لئے ہمیشہ سرگرم رہے اور ان کی سہولت کے حصول کے لیے حکومتِ وقت کو شرم دلاتے رہے ہیں اور اہل اقتدار سے الجھنے میں خوف سے مبرا تھے۔ بیواؤں کی پنشنوں کے لئے جب گیلانی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا تو اہلِ اقتدار نے انتہائی طیش میں دھمکی آمیز خط کے ذریعے اُن کو اطلاع کی کہ ان کے اہلِ خانہ ٹارگٹ پر ہیں، اگر وہ باز نہ آئے تو انجام کی سوچ لیں۔ بہرحال اُنہوں نے جدوجہد جاری رکھی اور بیواؤں کو اُن کا حق دلوانے میں کامیاب ٹھہرے۔

وہ بزم راولپنڈی کو ہمیشہ رہنمائی سے نوازتے اور ادارہ سے دل و جان سے وابستگی رکھتے تھے۔ اب ایسے مستقل مزاج رجال، خال خال ہی ملتے ہیں۔ احباب بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی اور ادارہ طلوعِ اسلام اُن کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں، اور مرحوم کے بلند درجات کے لئے دعا گو ہیں۔

ادارہ طلوعِ اسلام و ملک محمد سلیم (نمائندہ بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی)

خالد بشیر فاروقی، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میں ناخوش و بے زار ہوں مرمر کی سلوں سے

موجودہ دور میں سوشل میڈیا کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ کی طرح میں بھی روزانہ ڈھیروں واٹس ایپ ویڈیوز وصول کرتا ہوں اور یہ عادت سی بن گئی ہے کہ دیکھتے ہی فون سے ہٹا دیتا ہوں سوائے جن کی بہت اہمیت ہو۔

دوست کے اصرار پر ایک ویڈیو توجہ سے دیکھی جو کہ دنیا کی پانچ بڑی مساجد کے بارے میں تھی جن میں لاکھوں مسلمان نماز ادا کر سکتے ہیں یہ مسجدیں فنِ تعمیر اور لاگت کے لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی سبھی مساجد کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی آتا ہے۔

دنیا میں سب بڑی مسجدوں میں پہلا نام:

(1) مسجد الحرام مکہ سعودی عرب کا آتا ہے۔ 4 لاکھ مربع میٹر میں پھیلی یہ مسجد ایک انمول نمونہ ہے۔ ہر سال حج کے موقع پر 40 لاکھ سے زائد مسلمان اس میں نماز ادا کرتے ہیں اسے پہلی بار 622ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اب اس مسجد میں دنیا کے سب سے قیمتی پتھروں کو استعمال کیا گیا ہے۔ مسجد الحرام میں لگایا گیا ساؤنڈ سسٹم دنیا کا بہترین سسٹم ہے اور اس کے مائیک سونے کے ہیں۔ مسجد کی تعمیر پر 100 بلین ڈالر خرچ ہوئے۔

(2) دوسری بڑی مسجد، مسجدِ نبویؐ ہے۔ اس کی بنیاد نبی اکرم ﷺ نے رکھی تھی۔ اب اس میں بھی دنیا کا انتہائی قیمتی سنگِ مرمر لگایا گیا ہے۔ 3 لاکھ 24 ہزار مربع میٹر پر بنی اس مسجد میں 10 لاکھ سے زیادہ نمازی سماتے ہیں۔

(3) ایران کے شہر مشہد میں بنی مسجدِ علی میں ایک ساتھ 6 لاکھ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں اس کا رقبہ 2 لاکھ آٹھ ہزار مربع میٹر ہے۔ اس میں ایک لائبریری ایک موزیم اور 4 سیمینار ہال ہیں اس پر کئی سو کروڑ خرچ آیا تھا۔

(4) اس طرح چوتھی بڑی مسجدِ استقلال کا نام آتا ہے جو کہ انڈونیشیا کے شہر جکارتا میں ہے یہ بھی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار گنی جاتی ہے۔ 7 بلین ڈالرز میں بنی اس مسجد میں 2 لاکھ سے بھی زیادہ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

(5) ایک بڑی مسجد حسان مراکش کے شہر کاسابلانکا میں ہے۔ اس میں دنیا کی بہترین ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس مسجد کا آدھا حصہ زمین اور آدھا سمندر پر ہے۔ اس کے ایک حصے کا فرش شیشے کا ہے۔ جہاں سے سمندر کا پانی نظر آتا ہے۔ اس کے مینار کی اونچائی سب میناروں سے اونچی ہے۔ اس کو بنانے میں 35 ہزار مزدور روزانہ کام کرتے رہے۔

ایسی ہی دنیا میں ہزاروں مسجدیں ہیں جہاں ایک وقت میں کئی کروڑ مسلمان عبادت میں مصروف نظر آئیں گے اس طرح ایک اور ویڈیو دیکھی جس میں حیران کر دینے والی بات یہ تھی کہ جب انڈونیشیا میں فجر کی اذان ختم ہوتی ہے۔ تو ساتھ ہی ملائیشیا میں شروع ہو جاتی ہے۔ ابھی یہاں ختم نہیں ہوتی کہ بنگلہ دیش میں اذان ہونے لگتی ہے۔ اس طرح آگے بھارت پاکستان، افغانستان، ایران، عراق، شام، اردن، مصر، لیبیا، نائجیریا، الجزائر، مراکش میں اذانیں ہوتی چلی جاتی ہیں یوں اذانوں اور نمازوں کا یہ سلسلہ ٹوٹتا نہیں کیونکہ دوبارہ انڈونیشیا میں فجر کا وقت ہو جاتا ہے۔

یہاں تک کی تحریر پڑھنے والا الحمدللہ، سبحان اللہ کئی بار پکارے گا اور یہ درست بھی ہے کیونکہ امتِ مسلمہ کے پاس ''عبادت'' کا ایسا بنا بنایا نظام ہماری خوش قسمتی ہی تو ہے۔ جو عیسائی، بدھ، یہودی کسی قوم کے پاس نہیں۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ دیکھتے ہیں اگر کبھی مدینہ منورہ جائیں تو مسجدِ نبویؐ کے پاس کسی اونچی عمارت کی بالکونی میں کھڑے ہو کر مسجد کا نظارہ کریں۔ جمعہ کا وقت ہو اذان ہو رہی ہو آپ دیکھیں گے چاروں طرف سے سینکڑوں کاریں مسجد کے گرد پارک ہو رہی ہیں اور لوگوں کا سمندر مسجد میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ کرتے کیا ہیں؟ (1) اذان سنتے ہیں (2) ہزاروں گیلن پانی سے وضو کرتے ہیں (3) صاف دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہوں گے (4) پٹرول، گاڑی، مسجد میں لائٹس، اے سی اور بیشمار سہولیات پر خرچ اور وقت کا مصرف، 4 یا 6 رکعت پڑھ کر اسی کار میں پھر واپس کیا۔ صلوٰۃ قائم ہو گئی، کیا فحشاء و منکرات کا قلع قمع ہو گیا کیا یہاں ''رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً'' (2:201) کا عملی مظاہرہ ہوا ہے۔۔۔ قطعاً نہیں نہ کچھ حاصل ہوا نہ زندگی میں کوئی بہتری ہوئی۔

بندہ ایک مقصد لے کر کسی سفر کے لئے نکلتا ہے تو لازم ہے کہ وہ مقصد حاصل ہو انسان کی تو پیدائش ہی کسی مقصد کے لئے ہوئی ہے۔ انسان سے پہلے نباتات اور حیوانات کا رول ہی دیکھ لیں خاموشی سے اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مزید تفصیل میں نہیں جاتے صرف ایک موضوع پکڑتے ہیں اور وہ ہے۔

اذان:

پانچ وقت جو اذان دی جاتی ہے اس کے کچھ آداب ہیں مثلاً با آوازِ بلند ہونی چاہئے تا کہ سب سن لیں۔ آواز مسجد کے چاروں طرف جائے جب اذان ہو رہی ہو تو خاموشی سے سنو، ریڈیو، ٹی وی اور آپس کی گفتگو روک لو۔ یہ سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ اذان کے الفاظ سننے کے قابل اور نہایت اہمیت والے ہیں ان الفاظ کی اہمیت کیا ہے؟ ملاحظہ ہو:

1۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ: ایک دفعہ دوسری دفعہ تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ کیا چاروں طرف والے واقعی سن چکے کہ اللہ ''اکبر'' ہے۔

کبر کے معنی ہیں بڑا ہونا صِغر کی ضد ہے۔ کبریائی آج کی اصطلاح میں حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) ہے۔ سورۃ الجاثیہ (45) کی آخری آیت (37) میں فرمایا گیا ہے: وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾ ارض و سماء میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ ہی کا ہے یعنی انسانی دنیا میں رہنے کا اصول (آئین) صرف اللہ کے احکامات (وحی خداوندی) ہیں۔ اکبر کے معنی عمومی سوچ کے مطابق بڑا ہونا بے معنی سی بات ہے کیونکہ اس کے مقابل تو کوئی ہے

نہیں۔

2۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔۔۔ میں (با آوازِ بلند) شہادت دیتا ہوں کہ نہیں ہے کسی کی کبریائی، اقتدار، غلبہ، حقِ حکومت سوائے اللہ کے۔ اس سے سیدھا پیغام ملتا ہے کہ رہنے کے اصول اور قوانین (ریاست کا آئین) اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق ہوں گے۔ یہ بھی دو دفعہ بولا جاتا ہے کہ نہیں سنا تو سن لو۔

3۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہ: میں شہادت دیتا ہوں کہ ایک ہستی ''محمد ﷺ'' اللہ کے رسول ہیں۔ عربی مبین میں رسول کا مادہ ہے رس ل یعنی رسل معنی ہیں اطمینان اور سکون سے چل پڑنا۔ روانہ ہونا۔ رسول کے معنی ہوئے (ایک خاص مقصد کے لئے) چل پڑنے والا۔ غور کیجئے بیشمار عقائد اور روایات کی نفی ہوتی ہے۔ ''الرسول'' وہ شخص جو خدا کی طرف سے بندوں کے لئے بھیجا جائے۔ وہ شخص جو اپنے بھیجنے والے کی طرف سے مسلسل اور بتدریج پیغام پہنچائے۔ پیغام ہمیشہ کچھ عمل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ رسول سب سے پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتا ہے اور عمل پیرا ہوتا ہے اور اس وحی کو نظامِ زندگی بنانے کے لئے دوسروں سے اس کی اطاعت کرواتا ہے۔ یعنی اصول (وحی) ہوئے اللہ کے اور انہیں نافذ (Implement) کرنے والا رسول ٹھہرا۔ اس انقلاب آفرین پروگرام کا حوالہ ہے وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) ترجمہ: جو لوگ حکومت نہیں کرتے نازل کردہ پیغام کے مطابق وہی تو کافر ہیں۔

(4) حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ: یہ پکار ہے معاشرے کے لوگوں سے کہ آؤ صلوٰۃ کو قائم کرنے کے لئے۔ یہ بلاوا ہے مسجد سے۔ غرض کہ ارض خداوند پر انتہائی حسین معاشرہ تشکیل دینے کے لئے قرآن اس طرح راہنمائی کرتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط (22:41) یہ وہ لوگ ہیں جب انہیں زمین پر اقتدار حاصل ہوگا تو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ وہ معروف (Values) کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ یوں ''مساجد'' ہی ہیں جہاں اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۘ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ ۪ (42:38) کے مطابق فرموداتِ خداوندی پر عمل درآمد کا انتظام ہوگا۔ اس طرح ''مساجد'' میں معاشرے کے افراد ''ایک امام'' کی راہنمائی میں اللہ کے حضور جھک کر اطاعت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں گے ساتھ ہی معاشرتی نظم کو بہترین رکھنے کے لئے بھرپور کوشش کریں گے۔

5۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح: یہ بھی سب کے لئے پکار ہے کہ صلوٰۃ کے نظام کو اپناؤ گے تو فلاح ملے گی۔ فلاح کیا ہے ''نہ صرف ایسے کام جن سے معاشرے کے الجھے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ بلکہ ہمواریاں، خوشگواریاں بھی پیدا ہو جائیں۔ جن سے تمام افراد کی مضمر صلاحتوں کی نشوونما ہو جائے اور زندگی کا ارتقائی سفر جاری وساری رہے اور پھر اذان کے اختتام پر بھی اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کی مہر لگا دی کہ حکم ہے تو اللہ ہی کا ہے۔

آپ نے غور سے دیکھ لیا کہ اذان کا ہر جملہ کتنا معنی خیز ہے اس کے ایک ایک لفظ سے راہنمائی ملتی ہے۔ مگر ہے کوئی شخص جو اس پر دھیان دے۔ قول یا کلمہ کا صحیح صحیح مفہوم یہ ہے کہ ''کہ وہ مخاطب کا نقطہ نظر تبدیل کر دے۔'' بندہ اپنے آپ کو

اس پیغام کے مطابق ڈھال لے اور وہ کر گزرے جو اس نے سنا ہے۔ اذان سننے والا بندہ مسجد سے میدانِ عمل میں نکلے اور ایسے معاشرہ کی تعمیر میں کردار ادا کرے جو خالق کی ہدایت کے عین مطابق ہو۔

ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ باری تعالیٰ نے اشیائے کائنات کا ایک ایک ذرہ بامقصد پیدا کیا ہے مثلاً مٹی کا ایک ذرہ ہی لے لیں۔ ایک ڈھیری مٹی کے ذروں کی لیں اس میں پانی ملا کے گوندہ لیں اور ایک پیالہ بنالیں۔ پیاسا اس پانی سے اپنی پیاس بجھالے گا۔ (2) ایک کھجور کی گٹھلی پڑی کچھ نہیں دے رہی۔ زمین میں دبا دیں وہ نمی اور حرارت حاصل کر کے اپنا کام شروع کر دے گی۔ اس سے ننھا سا پودہ پھوٹے گا جو بڑھتا بڑھتا درخت بن جائے گا اور پھر لذت اور غذایت سے بھرا اور پھل بلا معاوضہ اپنے آپ کو پیش کر دے گا۔ نہ اس کا دماغ نہ زبان مگر قدرت کی طرف سے لگائی گئی ڈیوٹی پوری پوری انجام دے رہا ہے۔ یہ اس شجر کا خالق کے آگے سجدہ ہے جس کا تذکرہ سورۃ الرحمٰن میں آیا ہے وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۝ (55:6) اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ستاروں کا جم غفیر بھی خالقِ خائنات کے دیئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہے۔ اب آئیں حضرتِ انسان کی طرف جو ایک اکائی ایک یونٹ ایک Purposeful Entity ہے۔ جس کے امکانات کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

انسان کا کوئی بھی عمل بے نتیجہ کیوں ہو؟ وہ تو اللہ، رسول، وحی، کائنات، آخرت پر ایمان لایا ہوا ہے۔ ایمان کی تعریف ملاحظہ ہو ''بن دیکھے نتائج پر یقین کرنا'' جس وحی پر ایمان لایا ہوا ہے اس میں حکم ہے صلوٰۃ قائم کرو یعنی برابری کی سطح پر ایک منظم معاشرہ تشکیل پانا۔ مگر آج مسلمان ساری زندگی محض نمازیں پڑھتا رہتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ ایک شہر میں ایک بڑے ہسپتال میں پانچ سو ڈاکٹر ہوں وہ مریضوں کو چیک کر کے نسخے دے دیں وہاں نہ ڈائگناسٹک سیکشن ہو نہ آپریشن تھیٹر ہوں اور نہ فارمیسی بس مریض ڈاکٹر کے لئے نسخے ہی پڑھتے رہیں۔

اور آخر میں: ایک وقت تھا جب حرم شریف میں نہ آج جیسے بجلی کے قمقمے، نہ ٹھنڈی ہوا کی سہولت، نہ برقی سیڑھیاں، نہ چمکدار سنگِ مرمر، پتھریلے راستے، بلا کی گرمی، چھت گارے اور مٹی سے بنا ہوا اللہ کا گھر اور مسلم اُمہ کا عروج تھا۔ اب ہوائی جہاز کا سفر، ائیر کنڈیشنڈ حرم، سونے کے دروازے اور غلافِ کعبہ، شیشے جیسا فرش اور بیشمار سہولتیں، مگر مسلم اُمہ محکوم و مغلوب اس پر علامہ اقبال کا تبصرہ ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

خالد بشیر فاروقی، مئی 2020ء

ڈاکٹر اعجاز رسول، گلاسگو، یو کے
erasool@aol.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انسانی عقل، اُس کی حدود اور مکافاتِ عمل

اس مضمون کے لئے میں نے علامہ پرویزؒ کی کتاب ابلیس و آدم سے مدد لی ہے۔ جو بہن بھائی مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ اس کتاب کے وحی کے عنوان کے نیچے پڑھ لیں۔

اللہ کی ذات نے انسان کو پیدا کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کے لئے ذمہ دار ہے اور اس قانون جس کو قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے کے مطابق کسی کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ آیت کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر نفس کو اُس کے عمل کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ (45:22)

یہ ایک بہت ہی اہم آیت ہے جس پر کافی غور و خوض کی ضرورت ہے۔ اس کو صحیح طور پر سمجھنے سے انسانی تخلیق کی سمجھ آجاتی ہے اور اس پر عمل کرنے سے ہم انسانی مسائل کو بہت بہتر طور پر بہت جلد سمجھ جاتے ہیں اور دین کے نظام کو قائم کرنے میں یہ سمجھ معاون ثابت ہوگی۔ ظاہری طور پر یہ بالکل سادہ سی بات لگتی ہے لیکن غور کے بعد درج ذیل اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

(1) زمین اور آسمان کا سلسلہ اس لئے تخلیق کیا گیا ہے کہ ایک مخلوق پیدا کی جائے گی جس کو اختیار اور ارادہ دیا جائے گا اور اُس کو اس کے استعمال کے لئے شعور، عقل، خواہشات، جذبات، احساسات اور ایک طبیعی جسم سے نوازا جائے گا۔ میں نے یہاں ان چند کا ہی ذکر کیا ہے ورنہ ان میں ہر ایک مزید تفصیلات کا محتاج ہے۔

(2) چونکہ انسان کو اختیار و ارادہ ملا ہے۔ اس لئے اس کو ذمہ داری لینے کے لئے ''I'' یعنی ''میں'' بھی ملا ہے تاکہ اُس کو علم ہو کہ وہ ایک ذمہ دار ہستی کا مالک ہے۔ ''I'' کے ساتھ اُس کو شعور بھی دیا تاکہ وہ اپنی ''میں'' کو استعمال کرنے کے لئے عقل، جذبات، خواہشات اور جسم وغیرہ سے کام لے اور اپنی مرضی سے فیصلے کرے۔ ان اختیارات اور ارادہ سے اُسے ایک نفس ملا یعنی اُس کو اپنی ذات کا احساس، جس کو ہم نفس اور ذات کی اصطلاح سے اس مضمون میں ذکر کریں گے (45:22) آیت کے

دوسرے حصے میں اُس کے اس نفس کو پابند بنا دیا گیا ہے کہ اگرچہ اُس کے پاس اختیار وارادہ ہے لیکن وہ جو بھی فیصلے کرے گا اُسی طرح کے اثرات اُس کے نفس (اور باہر کی دُنیا پر) پر اثر انداز ہوں گے۔ اس لئے اُس کو ہر وقت باشعور ہونا چاہیے یعنی اُس کے خیالات اور اعمال کس نوعیت کے ہیں۔

(3) اس مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انسان کو یہ یقین دہانی بھی کروا دی گئی کہ چونکہ یہ قانون انسانی ذات پر اُس کے اپنے اعمال کے اثرات چھوڑے گا اس لئے اس نظام میں کوئی بھی عمل بے نتیجہ نہیں رہ سکے گا۔ اور چونکہ یہ اُس کے اعمال پر بھی اثر انداز ہوگا۔ اس لئے وہ اپنی دُنیا خود بنائے گا یعنی جیسے خیالات ویسی دُنیا۔

ظاہری طور پر اگر ہم ان تین نکات کو دیکھیں تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ہمیں زیادہ غور کرنے پر مجبور کرے گی۔ لیکن اس کو تھوڑا ٹھہر کر اور جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ سوچا کرو (34:46) اس پر غور کرنے سے مزید کئی پہلو ہمارے سامنے اُجاگر ہوتے ہیں۔ چند جو میرے مشاہدہ میں آئے ہیں میں آپ کے ساتھ اُن کو شیئر کرنا چاہوں گا۔

پہلے ذہن اور کائنات کے ساتھ انسانی نفس کے اعمال کو لنک کرنا آتا ہے۔ اگر ہم دیکھیں کہ بغیر انسان کے اس عالم کی مقصدیت باقی مخلوق میں سے کوئی بھی Appreciate کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اللہ کی ذات نے ہر چیز کو دنیا میں Create کیا ہے اس لئے اُس کو علم ہے کہ ہر ایک کا مقصد کیا ہے اور وہ کون سے کام میں مصروفِ عمل ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جس کا ہمیں علم ہے (ظاہر ہے کہ اور بھی بااختیار مخلوق ہوں گی لیکن اس مضمون کے لئے ہم یہ کہیں گے) اور چونکہ ہمارے پاس عقل ہے جس میں قوت ہے کہ ہم سوچ کے متعلق سوچ سکتے ہیں اس لئے ہم اپنی دُنیا اور وہ حصہ کائنات کا جس تک ہماری رسائی ہے اس کو اپنی سمجھ اور علم کے مطابق کوئی نہ کوئی meaning دیتے ہیں۔ ابھی ظاہر ہے کہ جو بھی ہم سوچیں گے اُس کا کچھ اثر ہماری ذات پر بھی پڑے گا اور بعض اعمال بھی اس سوچ سے عملی زندگی میں نمودار ہوں گے۔ مثلاً سائنس کا جتنا بھی کام فزکس کے تحت ہو رہا ہے اُس میں سے کافی ذہن کی فضا اور سماوات کے دائروں میں آتا ہے۔ اسی طرح مواصلات کے دائرہ میں اتنی ترقی ہوئی ہے اس کا اثر بھی انسانی ذات پر پڑتا ہے اور قانونِ مکافات نے انسانی دُنیا میں ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ کئی جرائم جو پہلے چھپے رہتے تھے اب سمارٹ فون کے کیمرہ کی وجہ سے عام انسانوں کے علم میں آرہے ہیں۔ مواصلات میں ترقی کی وجہ سے دُنیا میں عام انسان اب زیادہ قریب آرہے ہیں اور قرآن نے جو کہا تھا کہ عوام اللہ کی ربوبیت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے (83:6) تو بہت ممکن ہے کہ COVID-19 کے بعد کی دُنیا میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ طلوعِ اسلام اس سلسلہ میں عام انسانوں کو اس نظام کے خدوخال سے روشناس کرا سکے (یہاں دیکھیں کہ وحی کس طرح انسانی عقل کی حد کو پھیلانے میں مدد کرتی ہے اس پر بعد میں بات ہوگی۔)

اِدھر سے ہی انسانی Creation کے متعلق ایک اہم بات سامنے آتی ہے۔ انسان ہر کام یعنی اپنی خواہش کے مطابق اپنی عقل کے ذریعہ کرتا ہے۔ مثلاً میری خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ضرورت کی چیز خریدی جائے۔ جونہی خواہش ذہن میں آئے

گی عقل مجھے بتائے گی کہ میرے پاس رقم ہے اس لئے میں خرید سکتا ہوں۔ یہ سب کام شعور کی حدود کے اندر ہو رہا ہوتا ہے اور ''میں'' اس کو جانتا ہے۔ یعنی ''میں'' اپنے شعور کے اندر عقل اور خواہش کو جان رہا ہوتا ہے۔ لیکن دیکھیں اس وقت قدر صرف یہ ہے جو فیصلہ میں مدد دے گی کہ خواہش نے کیا ہے اور عقل نے بتایا اور میں نے فیصلہ کرنا ہے اور یہ سب شعور کے اندر ہو رہا ہے۔ اور یہ فیصلہ جب عمل کی صورت میں نمودار ہو جائے گا یعنی وہ چیز خریدی جائے گی تو وہ میرے نفس یا ذات کا حصہ بن جائے گی۔ اب دیکھیں کہ اس میں کہیں بھی قرآن اور ان اقدار کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ یہ ہے عقل ہماری خواہش اور جذبہ کا باہمی تعلق۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت کبھی بھی اس ضرورت کو محسوس نہیں کرتی کہ اس زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد بھی ہوسکتا ہے۔ ہمارے اندر کوئی ذات ہے جو موت کے بعد زندہ رہ سکتی ہے۔ کیونکہ (8:24) کے مطابق وہ جب ''زندہ'' ہی نہیں ہے تو وہ آگے جانے کا سوچے گی کیسے؟ (36:70)

پہلی زندگی طبیعی صورت میں ہمیں مل گئی اور اس کا طریقہ کار ہمارے علم میں ہے۔ لیکن اپنا جہان عقل کے مطابق بنانے سے جو کہ خواہشات کو عملی جامہ پہناتی ہے، ہم سوائے اپنے لئے اور باقی انسانوں کے لئے مسائل پیدا کرنے کے کچھ اور نہیں کر سکتے۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ خوف اور حزن ہوگا۔ جو دُنیا ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں یہ خالص انسانی عقل کی پیداوار ہے۔ اس لئے اس میں مادی ترقی کے باوجود ذہنی فساد ہر طرف موجود ہے جو کہ عقل حیلہ جو کا پیدا کردہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان نے طبیعی میدان میں عقل کو استعمال کر کے بے پناہ ترقی کی ہے۔ جو کہ طبیعی میدان میں مکافاتِ عمل کا عملی مظاہرہ ہے۔ لیکن چونکہ انسانی عقل انہی خواہشات اور جذبات کی مقید ہو کر اپنے آپ کو محدود کر لیتی ہے یا ہو جاتی ہے اس لئے ان طبیعی ترقی کے فائدوں کو پوری انسانیت کی منفعت کے لئے مناسب طریقے سے استعمال کرنے میں قاصر ہے۔ ہر فرد اور قوم کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی خواہشات کو پورا کرے اور عقل اس میں اُن کی مدد کرتی ہے۔

یہاں ایک اور اہم مشاہدہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ جو اقوام مذہبی عقائد کا شکار ہیں وہ طبیعی ترقی سے بھی محروم ہیں کیونکہ اُنہوں نے اپنی عقل کو غلط عقائد کی زنجیروں میں باندھ رکھا ہے۔ یعنی وہ عقل کی اپنی قابلیت سے بھی پورا فائدہ اُٹھانے سے محروم ہیں۔ یہ ایک اہم نفسیاتی نقطہ ہے جس کو سمجھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ یعنی طلوعِ اسلام کے قرآنی طالبعلم کے لئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ میری ''I'' اور شعور عقل سے کام لیتے ہیں۔ یعنی عقل کے استعمال سے جو حقیقت ہم اپنے شعور کے اندر بناتے ہیں وہ ہماری ذات ہوتی ہے۔ اگر ہم نے بذریعہ اپنے جذبات مذہبی غلط عقائد مثلاً قسمت کو اپنی عقل کے ذریعہ قبول کر کے اپنے شعور میں جگہ دے دی ہے۔ تو یہ غلط عقیدہ وائرس کی طرح ہر خیال کو اپنے معیار پر پرکھے گا اور اگر وہ خیال کتنا ہی سچا کیوں نہ ہو اس کو رد کر دے گا کیونکہ اس کو پسند نہیں آئے گا۔ اس مثال سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح ہمارے عقائد اپنے زہریلے پن کا اظہار ہمارے شعور میں کرتے ہیں اور عقل کے دائرہ کو مزید محدود کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ''مذہبی'' ذہن یا عقل کبھی بھی غیر مذہبی عقل یا خالص عقل کا مقابلہ نہیں کر سکتی یہاں میں عقل کو مجموعی طور پر لے رہا ہوں یعنی

قومی سطح پر۔

اس کی چند اور مثالیں ہمیں آج کل COVID-19 کے سلسلہ میں بھی مل رہی ہیں۔ امریکہ میں صدر ٹرمپ اس نعرہ پر الیکشن جیت کر آئے کہ امریکہ کو دوبارہ عظیم بنانا ہے۔ لیکن اُنہوں نے عظیم کو کبھی بھی Define نہیں کیا جس کا نتیجہ تھا کہ جب انسانی گول کو ہم ٹھیک طرح Define نہیں کرتے تو وہ گول کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک جذباتی نعرہ تھا جس کا حقیقت کی دُنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی خاصیت ہے کہ اس میں سرمایہ کے اردگرد پورا نظام گھومتا ہے۔ پھر جس شعوری سطح پر انسان ایک مسئلہ Create کرتا ہے اُس کو حل کرنے کے لئے اُس کو ایک دوسری شعوری سطح پر جانا پڑے گا۔ ورنہ وہ اُس کے مسائل ہی میں الجھ کر رہ جائے گا۔ ٹرمپ نے قومیت کا نعرہ لگا کر اور قوت کے بل بوتے پر دوسرے ممالک سے مالی طور پر فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جس کا اُس کو عارضی طور پر کچھ فائدہ بھی ہوا۔ لیکن چونکہ دُنیا میں چین اب ایک کمزور لیکن متبادل امیر قوم کے طور پر اُبھر رہا ہے اس لئے ٹرمپ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح اس توازن کو تبدیل کیا جاسکے۔ لیکن مکافاتِ عمل اپنا رنگ COVID-19 کی صورت میں دکھانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ وائرس کس طرح شروع ہوا ہمیں اُس بحث میں جانے کی فی الحال ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے اثرات کچھ ماہ میں اپنے مزید اثرات دکھانا شروع کریں گے۔ لیکن انسانی عقل کے سامنے چونکہ اس کی اپنی محدودیت ہے اس لئے وہ اس میں الجھ کر رہ گئی ہے اور موت سے خوفزدگی نے سارے ملکوں کو Paralyse کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم سب چونکہ اس مکافاتی عمل میں سے گزر رہے ہیں اس لئے ہمیں انسانی عقل کے تماشوں کو غور سے دیکھنا چاہیے۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ وحی ان مسائل کا حل کس طرح عقل کو سمجھاتی ہے یا عقل وحی کی روشنی میں اپنی حدود کو ختم کر کے اللہ کے تخلیقی عمل میں بھرپور کردار کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیتی ہے۔

ابھی ہم (45:22) کے دوسرے حصہ کی طرف آتے ہیں۔ اگرچہ مکافاتِ عمل کے متعلق ہم نے اوپر بھی بات کی ہے لیکن یہاں ہم اس کے خصوصاً انفرادی حصہ کی طرف آتے ہیں یعنی اس میں میرے لئے کیا ہے۔ مذہب کی دُنیا اور عام دنیا میں بھی ایک محاورہ ہم نے سن رکھا ہے کہ ''جیسا بوئیں گے ویسا کاٹیں گے'' لیکن یہ اُس وقت ہی بولا جاتا ہے۔ جب ہم کسی اور کو اُس کے غلط اعمال کی وجہ سے دیکھتے ہیں کہ کوئی غلط نتیجہ مل گیا ہے۔ لیکن خود ہمارا کم ہی اس طرف خیال جاتا ہے کہ یہ ایک قانون ہے جو جس طرح دوسرے کو لاگو ہے اُسی طرح میرے پر بھی لاگو ہے۔ پھر مذہب نے اس معاملہ میں تباہی پھیر دی ہے۔ اُس نے اپنے جذباتی عقائد لا کر انسان کو انتہائی غیر ذمہ دار بنا دیا ہے اور جس کا نتیجہ ہے کہ انسان اس عقل سے بھی پوری طرح فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور خود ہی اپنے اوپر پابندیاں لگا کر اپنی دُنیا کی زندگی کو انتہائی پریشان اور خوف میں گزار دیتا ہے اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ''مذہب'' جن حضرات نے ماضی میں بنایا ہے وہ دراصل مکافاتِ عمل سے بغاوت تھی کہ کسی طرح ذمہ داری سے بچا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آیت کم ہی وعظ کا موضوع بنتی ہے۔

اس آیت میں قرآن نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ انسانی تخلیق ایک سنجیدہ مرحلہ ہے اللہ کی تخلیقی اسکیم کا جس میں

ایک اختیار وارادہ رکھنے والی ہستی کو مناسب ماحول بنا کر دُنیا میں لایا گیا ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کیسے آ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میں یہاں ہوں اور موت میرے آگے کھڑی ہے اور چونکہ جسم نے ختم ہوجانا ہے اس لئے میں نے اس مسائل سے بھری ہوئی دنیا میں زندگی کیسے گزارنی ہے؟ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں یہ ایک اہم سوال ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ سلسلہ زمین اور سماوات اس لئے حق ہے کہ ہر نفس کو اپنے اعمال کی پوری جزا مل جائے۔ یہ وہ نفس ہے جس نے موت کا تجربہ کرنا ہے (3:185) یعنی اس کو موت نہیں آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ نفس یا زندگی نہیں ہے جو کہ موت کے ساتھ ختم ہوجاتی اور جس پر اس قدر رونا دھونا اور افسوس ہوتا ہے۔ نفس کے لیول پر چونکہ اختیار وارادہ ہے اس لئے اگر یہ اپنے اعمال کے متعلق باخبر رہتا ہے تو لامحالہ اس کو مکافاتِ عمل کے مطابق اس کا بھی شعور ہونا چاہیے کہ ان اعمال کے نتائج کیا ہونگے؟ اس لئے مکافاتِ عمل کے قانون کو سمجھنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا انسان اپنے اختیار وارادہ سے اُس طرح مکمل طور پر باشعور ہیں جس طرح قرآن نے کہا ہے کہ ہونا چاہیے؟ کیونکہ اگر ہم پوری طرح باشعور نہیں تو مکافاتِ عمل کا قانون بے معنی ہوجاتا ہے۔ جس طرح اگر مجھے علم ہی نہیں یا شک ہے کہ آگ میری انگلی کو جلا دے گی تو ممکن ہے کہ میں کسی وقت غلطی سے ایسی حرکت کر بیٹھوں اور میری انگلی جل جائے۔ مثلاً دیکھیں آیت (6:70)۔

اگر ہم اپنے اختیار وارادہ کو پورے شعور کے لیول پر نہیں سمجھتے تو یہ ہماری عقل پر ایک Limit ہے۔ مثلاً مغرب میں Health & Safety پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اس سے یہاں صنعتی حادثات بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں ابھی اس پر پوری توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ قوانین مغرب میں شواہد پر مبنی ہیں جو مکافاتِ عمل کا حصہ ہے۔ اگر عقل اپنے اختیار وارادہ سے مکمل طور پر Convince ہوجاتی ہے اور اُس کے بعد اُس کو علم ہوجاتا ہے کہ اُس کے ''I'' کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرے گا اور یہ ایک قانون ہے تو عقل نے اپنی حد کو پہچان لیا ہے۔ اور یہ حد کی پہچان اُس کو اس زندگی کے گزارنے میں مدد دے گی۔ یعنی عقل اپنی ''I'' کے زیر اثر یہ دیکھے گی کہ جس نظام میں یہ موجود ہے اُس میں اُسے کس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے۔ تاکہ اُس کی یہ زندگی اچھی گزر جائے (اور اگلی بھی اگر عقل زیرِ قرآن آئی ہے۔)

اس صورت میں عقل نہیں سوچے گی کہ چونکہ زندگی نے جسم کی موت کے ساتھ ختم ہوجانا ہے اس لئے اس طبیعی زندگی کی ضروریات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ عقل کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اُس کے اس طرح کرنے سے کسی اور کا نقصان ہوتا ہے (یا نفع بھی ہوتا ہے اُسے اپنے نفع سے غرض ہوتی ہے۔)

یہ حالت ہماری دُنیا کی ہے جو کہ اکیلی انسانی عقل نے تخلیق کی ہے۔ آپ غور سے ریڈیو، ٹی وی، اخبار اور عام انسانوں کا مطالعہ کریں۔ کہیں بھی طبیعی زندگی کے معاملات سے باہر کی بات نہیں ہوگی۔ مثلاً کیا انسان کے اندر ذات ہے؟ موت کے بعد کی زندگی کی Possibility انسانی ذات کی Accountability، انسانی زندگی کا مقصد، موت کی اہمیت وغیرہ قرآنِ خالص کی بات بھی (45:22) کے بغیر ہوتی ہے۔ یعنی انسان مکافاتِ عمل کے قانون سے نفرت کرتا ہے۔ جبکہ اس کو سمجھنے سے

اُس کو زندگی ملتی ہے۔

ابھی اگلا سوال ہے کہ نفس نے اپنے اختیار وارادہ کو جان لینے کے بعد کیسے اعمال کرنے ہیں جن سے اُس کے شعور کی سطح پہلے سے بہتر ہو جائے۔ یہ ہم بعد میں لیں گے جہاں انسانی عقل کا دائرہ وحی کی روشنی میں بلند کرنے کی بات ہوگی۔

آیت (45:22) کا تیسرا حصہ ہے کہ مکافاتِ عمل اس طرح کام کرتا ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی کا کوئی چانس نہیں۔ یہ ایک اہم حصہ ہے جس سے ہمیں مکافاتِ عمل کے قانون کے کام کرنے کے طریقہ کار کی سمجھ آتی ہے۔ اس میں قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل اور Evidence بھی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ انسان کو اختیار وارادہ دینے کا مقصد یہ تھا کہ اُس کو پوری آزادی دی جائے کہ وہ جو فیصلہ چاہے کرے لیکن اُس کو اس کی آزادی نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ اس فیصلہ کا نتیجہ اپنی مرضی سے نکالے۔ اس اختیار وارادہ کی ایک خوبصورت مثال وہ ہے جہاں حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام فرعون کی طرف جاتے ہیں (46-20:43)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ میں فرعون کی طرف سے خائف ہوں کہ وہ ہمارا نقصان نہ کردے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ خائف نہ ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ فرعون ایسا نہیں کرے گا اور نہ ہی یہ تسلی دی کہ ہم اُسے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ صرف کہا کہ ہم وہاں موجود ہوں گے اور اس کے اندر یہ تسلی ہے کہ مومنین کو نقصان نہیں پہنچنے دیتے۔ آپ نے دیکھا کہ فرعون کے اختیار وارادہ کو سلب نہیں کیا۔ لیکن ساتھ مکافاتِ عمل کے کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔[1]

یہاں تک ہم نے انسانی عقل اور مکافاتِ عمل کے چند پہلو دیکھے ہیں۔ بحیثیت قرآنی طالبِ علم اور اس خواہش کے علمبردار کہ دین کا نظام اس دنیا میں شروع ہو سکے ہماری نظر انسانی عقل کی محدودیت پر ہونی چاہیے یعنی آج کے زمانہ میں انسانی عقل کہاں تک پہنچ سکی ہے۔ سیاسی میدان میں انسانی عقل سرمایہ داری نظام کے ماتحت کام کر رہی ہے یعنی سرمایہ اور سرمایہ دار اس نظام کو چلا رہا ہے۔

اگر ہم ان سکالرز کا مطالعہ کریں جنہوں نے اس انسان کُش نظام سے تنگ آ کر ایک بہتر نظام کی تلاش کی ہے مثلاً Erich Fromm، Carl Gustav Jung وغیرہ[2] وہ ایک ایسا نظام تلاش کرتے ہیں جس میں ہر انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے اور اُس کی تمام ضروریات زندگی مناسب طریقہ سے پوری ہو سکیں ساتھ ہی وہ زندگی کو خوشی سے بغیر خوف کے گزار سکے۔ جس میں انسان جو کام بھی کرے اُس میں اُس کی اپنی نشوونما اور خوشی شامل ہو۔ وہ کسی انسان کا ذہنی اور طبیعی طور پر غلام نہ ہو۔ لیکن ان سب کی تحریروں میں آخرت کی زندگی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ کیونکہ یہ سب اس مفروضہ پر کام کرتے ہیں کہ انسانی زندگی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

---

(1) میں نے یہاں مزید تفصیل نوٹ نہیں کی اور طلوعِ اسلام کے قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود اس پر غور کریں۔ اس طرح اور بھی آیات ہیں جو کہ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں غور وخوض کی محتاج ہیں۔ (2) پرویز صاحب نے اپنی کافی کتابوں میں ذکر کیا ہے مثلاً انسان نے کیا سوچا؟

لیکن چونکہ ان حضرات کے خیالات کتابوں تک ہی محدود رہے اور جن لوگوں کے پاس حکومت تھی اور ہے اُن کی عقل کا تقاضا صرف انہی خواہشات کو پورا کرنا ہے اس لئے اس قسم کی محدود عقل کے ساتھ نظام میں بہتری آنا تو ایک طرف مزید انحطاط آتا جاتا ہے۔ جس کا مظاہرہ ہم COVID-19 کے سلسلہ میں ساری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ مذہب کی دُنیا جہاں عقل مفلوج ہوتی ہے کبھی بھی اس کا حل تلاش نہیں کرسکتی اور چونکہ مکافاتِ عمل کبھی بھی رُکا نہیں اس لئے حالات بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ (صرف دین کے نظام میں حالات بہتر ہونے کی گارنٹی ہوتی ہے۔ (35:10))

ابھی میں عقل کی محدودیت کو دُور کرنے کے لئے وحی کی ضرورت کی طرف آتا ہوں۔ یہاں تک مختصراً ہر بات ظاہر ہے کہ انسان اُسی کام میں دلچسپی رکھتا ہے جس میں وہ اپنا فائدہ دیکھتا ہے یا اُس کے اندر خواہش ہوتی ہے پھر اُس کی عقل اُس کے لئے اُس کو طریقہ بتاتی ہے یا سمجھاتی ہے اور انسان اُس کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے۔ یہاں پر یہ سوال ذہن میں اُٹھتا ہے کہ عقل کی محدودیت کا اگر علم ہی نہیں تو انسان اس کی طرف آئے گا کیسے؟ اگر انسان اپنی موجودہ زندگی کو کامیاب تصور کرکے اس پر خوش ہے تو اس کو کیوں ضرورت محسوس ہو کہ وہ اس کے لئے کوشش کرے کہ موت کے بعد زندگی کا سراغ لگانا چاہیے؟ اگر موجودہ دُنیا انسانی عقل کی پیداوار ہے تو ہم قرآن کی مدد سے اپنی عقل کی حدود بڑھا بھی دیں تو یہ اس نظام کو تبدیل کرنے میں کیسے معاون ہوگی؟ یعنی چونکہ اپنی عقل کی حدود بڑھانے میں جو ہمت اور کوشش درکار ہے ہم اس کے لئے تب تیار ہوں گے جب ہمیں کوئی تسلی ملے کہ نظام بدلا جاسکے؟ ہم عقل کی حدود کو اس لئے بڑھانا چاہیں گے کہ اس سے انسانی مسائل کے حل میں مدد ملے گی اور ہم قرآن کی تعلیم کو بہتر طور پر سمجھ کر دین کے نظام کے لئے کام کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ ہم آخرت کی زندگی کی اہمیت کو جان سکیں گے۔ اور آخرت سے یہاں مراد وہ زندگی بھی ہے جو کہ ابھی ہم نے اس مضمون کو پڑھ کر ابھی اس دنیا میں گزارنی ہے یعنی اس زندگی کا باقی حصہ اور آخرت کی زندگی ہماری طبعی موت کے بعد۔

یہاں پر ایک اہم نقطہ ہماری توجہ چاہتا ہے۔ قرآن انسانی ذات کے تجزیہ کے لئے روشنی مہیا کرتا ہے تاکہ ہم میں سے ہر ایک یہ دیکھ لے کہ اُس کی ذات کس حد تک ترقی یافتہ ہے اور کیا وہ دین کے نظام کو قائم کرنے کے قابل ہوگئی ہے۔ اگر نہیں ہوئی تو اُس میں ابھی کتنی کمی باقی ہے جس کو پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک بہت اہم موضوع ہے اور کافی تفصیل چاہتا ہے۔ اس کو ہم کسی اور موقع کے لئے چھوڑتے ہیں۔ موت کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ ہم ذات کی جس حالت میں اس دُنیا کو چھوڑ کر جائیں گے اُسی حالت (State) میں ہماری اگلی دُنیا میں زندگی شروع ہوگی۔ اگر ہم مطمئن ہیں کہ ہماری ذات کی اطمینان بخش حد تک نشوونما ہوچکی ہے تو ہمیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں؟ لیکن اگر ابھی دین کا نظام شروع بھی نہیں ہوا تو ہم اپنی کوششوں کو روک نہیں سکتے۔ کیونکہ انسانی مسائل صرف اس لئے بڑھ رہے ہیں کیونکہ دُنیا میں دین کا نظام ماڈل کے طور پر کہیں پر بھی نہیں۔ اور دین کے نظام کو قائم کرنے والوں کی عقل جب تک وحی کی ضرورت کو مکمل طور پر سمجھ کر اپنی عقل کو محدودیت سے نکال وحی کی غیر محدودیت والی روشنی میں نہیں لائیں گے اُن کی عقل کبھی بھی دین کے لئے کام نہیں کرسکتی! اور

قرآن کے مطابق کبھی بھی دُنیا میں اقتدار نہیں مل سکتا یعنی اُنہوں نے اگر انسانی حد تک (عزیز) بننا ہے تو پھر (35:10) پر عمل کرنا ہوگا!

بعض اوقات سننے میں آتا ہے کہ ہماری ذات دین کے نظام کے باہر نشوونما نہیں پاسکتی۔ یہ قرآن اور مشاہدہ کی روشنی میں صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت انفرادی طور پر شروع کی تھی۔ اور آہستہ آہستہ افراد اُس میں شامل ہوتے گئے۔ مکہ کے 13 سال صرف نظریاتی طور پر لوگوں کو تیار کرنے میں گزر گئے۔ فرد کو ابتدائی طور پر مومن خود بننا ہوتا ہے۔ چاہے وہ دین کا نظام ہو یا غیر دین کا نظام۔ اس لئے فرد کی اہمیت ہمیشہ وہی رہتی ہے۔ کیونکہ ذات غیر منقسم وحدت ہے۔ ہاں البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذات کی نشوونما دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کی محتاج ہے۔ دین ہمیشہ غیر دینی نظام میں سے ہی جنم لے گا کیونکہ اکثریت انسانوں کی اپنی عقل کے دائرہ کار سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔ مومنین اس کا مشاہدہ خود کر سکتے ہیں۔ انسانی ذات کی ترقی قرآنی اور غیر قرآنی دونوں قسم کے انسانوں کی محتاج ہے جہاں تک اس دُنیا کا تعلق ہے۔

قرآن ہمیں چونکہ غیر دینی نظام سے دینی نظام کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لئے اُس نے غیر دینی نظام کی ساری ضروری تفاصیل بیان کر دی ہیں۔ مثلاً اس نے یتیم، مسکین، ناانصافی، ظلم، غلامی، سرمایہ داری، منافقت، کفر، شرک وغیرہ کی تعریف اور اُن کو مثالیں دے کر سمجھایا ہے اور ان کا اثر فرد اور قوموں پر بیان کیا ہے۔ یہ سب مسائل عقل کی محدودیت کے پیدا کردہ ہیں اس لئے قرآن پہلے ہماری توجہ ان مسائل کے مشاہدہ کی طرف مبذول کرجاتا ہے وہ کہتا ہے کہ چونکہ سب انسان برابر ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اُن کے لئے ایسے حالات پیدا کئے جائیں تاکہ اُن کی نہ صرف طبیعی ضروریات زندگی پوری ہوں بلکہ اُس کے ساتھ اُن کی ذات کے لئے جو کچھ بھی چاہیے وہ بھی مہیا کیا جائے تاکہ وہ ضروریات پوری کر کے وہ نشوونما پاسکیں۔ جب وہ یہ کہتا ہے تو ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو افراد اس کا بیڑہ شروع میں اُٹھاتے ہیں اُن کو اپنی ذات کو اس لیول پر لانا ہوگا تاکہ وہ اس کام کو اپنی دل کی رضامندی سے کریں اور اس میں خوشی محسوس کریں اگر وہ محسوس کریں کہ یہ باہر سے عائد کردہ بوجھ ہے تو وہ یہ کام نہیں کر سکیں گے۔ ظاہر ہے یہ اُسی وقت ہوسکتا ہے جب انسان اپنی مرضی سے ایمان لے کر آئے یعنی اللہ کی ذات اُس کی ذات کے لئے ماڈل بن جائے اور پھر وہ اعمال صالح کی شاہراہ پر گامزن ہوجائے۔ اس سے اُس کی عقل درج ذیل اہم نقاط کو آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی اور اُس کی محدودیت آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوجائے گی۔ اس سے اُس کے شعور کی دنیا میں وسعت آنی شروع ہوجائے گی۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا! (8:28)۔

(1) عقل کی وسعت اس لئے چاہئے تاکہ جو عقل خواہشات کے پیچھے چلتی ہے اُس کی سمت تبدیل کر کے اُس کو وحی کی اقدار کے نیچے لے آیا جائے۔ ظاہر ہے یہ عمل باہر سے Force نہیں کیا جاسکتا یہ انسان نے خود اپنے اندر سے خواہش پیدا کر کے عقل کو Convince کرنا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ایک نئی عقل نے پرانی عقل کو بتانا ہے کہ زندگی کا کام اس طرح نہیں چلے گا۔ ہمیں تبدیل ہونا پڑے گا تاکہ انسانیت کے مسائل جو پرانی عقل نے Create کئے ہمیں اُن کو حل کر کے

آگے بہتر دُنیا کی طرف بڑھا جائے۔ یہ سوچ ہی پہلا قدم ہے عقل کی محدودیت کم کرنے کا۔ کیونکہ پہلے عقل نے ایسا نہیں سوچا تھا اور جونہی ہم اس سوچ کی طرف آتے ہیں تو ہماری عقل یا ہم اپنی خواہشات کے باہر سوچنا شروع کر دیتی ہے۔

(2) مکافاتِ عمل کو سمجھنے سے عقل کا دائرہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ انسان نہ صرف اپنے اعمال کے متعلق زیادہ آگہی حاصل کر لیتا ہے۔ بلکہ دوسروں کے اعمال کو بھی آہستہ آہستہ بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انفرادی اعمال اور جو خیالات ان کو کرنے کا محرک بنتے ہیں اُن کا غور سے تجزیہ کرنا عقل کا کام ہونا چاہیے یعنی ہمارے شعور کی سطح کو آہستہ آہستہ بلند ہونا چاہیے۔ مثلاً آج COVID-19 کے سلسلہ میں جہاں ملک اور دُنیا ہے یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا اس کے لئے ہمیں صدیوں پیچھے جانا پڑے گا اور مکافاتِ عمل کے قانون کے تحت اس کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ اس میں قرآن کی اُن آیات کو دیکھنا پڑے گا جو قوموں کی موت اور حیات کے متعلق ہیں۔ مذہب کی دنیا میں فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ نے کیا ہے اور پھر توبہ اور استغفار شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ اللہ نے تو صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ ہم انسان پر ظلم اور ناانصافی نہیں کرتے انسان اپنے اوپر خود ظلم کرتا ہے (10:44) اگر ہم مکافاتِ عمل کے طریقہ کار کو نہیں جاننے کی کوشش کرتے تو ہماری عقل کی محدودیت کبھی بھی کم نہیں ہو سکتی بلکہ ہم غلط عقائد میں اور پختہ ہو کر اپنی زندگی کو اور مشکل بنا لیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو دُنیا صرف عقل پر بنی ہوئی ہے اُس میں امن نہیں قائم ہو سکتا اور حالات خرابی کی طرف ہی جاتے ہیں۔ تھوڑی بہت انفرادی خوشحالی فریب انگیز ہوتی ہے۔

(3) اس سے یہ نقطہ سامنے آتا ہے کہ مکافاتِ عمل ہمیں یہ بھی علم دیتا ہے کہ موجودہ حالات مستقبل میں کیا نتائج پیدا کرنے والے ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم لگائیں تو شیشم کا درخت لیکن توقع کریں آموں کی۔ جیسا بوئیں گے ویسا کاٹیں گے۔ لیکن چونکہ یہاں عقل کی حدود بڑھانے کی بات ہو رہی ہے۔ ہمیں اپنے موجودہ حالات کے متعلق جتنا بھی ممکن ہے علم ہونا چاہیے اور عقل و بصیرت کی روشنی میں قرآن کی اقدار کو سامنے رکھتے ہوئے حالات کا تجزیہ کرنا چاہیے تاکہ علم ہو سکے کیا آنے والا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں پھر بھی پورا علم نہ ہو سکے لیکن کم از کم وارننگ تو مل جاتی ہے۔ لیکن یہاں سوال دین کا ہے یعنی ہماری عقل کو ہمیں زیادہ ہمت اور رفتار کے ساتھ کام کرنے پر لگانا چاہیے کیونکہ دین کے نہ ہونے پر تو دُنیا کی حالت یہ ہو گئی ورنہ اگر مومنین نے بہتر طریقہ سے اپنی روش کو چلایا ہوتا تو دُنیا میں کم از کم کہیں تو ''اللہ کی حکومت'' قائم ہو سکتی تھی اور یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہم اس بات کی شکایت بار بار کرتے ہیں کہ یہ دوسرے انسان اور حکومتیں مسائل کیوں حل نہیں کرتیں تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ ہماری عقل محدود دائرہ میں کام کر رہی ہے اور قرآن کی روشنی سے فائدہ اٹھانے سے ابھی قاصر ہے۔ یاد رکھیں دین کا نظام انسانی ہاتھوں سے مرتب ہوگا۔ یعنی میرے اور آپ کے ہاتھوں سے اور یہ ہاتھ تب نظام کو لا سکیں گے جب یہ اُس عقل کے تابع ہوں گے جو وحی کی روشنی کو پہلے سمجھیں گے اور پھر اُس پر عمل کر کے آگے بڑھیں گے۔ طلوعِ اسلام اس کے لئے ہمیں Platform مہیا کرتا ہے۔ دین کا نظام کبھی بھی محدود عقل

قائم نہیں کر سکتی۔ (1)

یہاں پر میں ایک مثال کے ذریعہ اس کو Share کرنا چاہتا ہوں۔ COVID-19 کے سلسلہ میں مغرب میں مالی مشکلات شروع ہوگئی ہیں۔۔ میں نے ان حالات کی Forecast کافی سال پہلے کی تھی لیکن مجھے ایسا وائرس کے ذریعہ ہونے کا بالکل خواب وخیال بھی نہ تھا۔ اب جب یہ مشکل حالات آ گئے ہیں جو کہ چاہے قدرتی وائرس سے ہوئی ہیں یا پھر انسانی وائرس سے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل اصول یہ ہے کہ مکافاتِ عمل کی کم علمی کا نتیجہ ہے۔ اگر ابھی ہم ان قوموں کی حالت پر افسوس کرنے بیٹھ جائیں تو یہ مکافاتِ عمل کی کم علمی کا نتیجہ ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام جب بستی چھوڑ کر جا رہے تھے اور پیچھے بستی پر اُن کے اعمال کا نتیجہ آ گیا تھا تو وہ واپس مڑ کر اُن کو بچانے نہیں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ہمیں وہ سب حالات اپنے ذہن یا شعور میں رکھنے چاہیے جن کی وجہ سے طاقتور قوموں نے دُنیا کو یہاں پہنچایا ہے۔ یاد رکھیں دُنیا میں Status quo کہیں بھی نہیں ہے۔ جمود قرآن کے مطابق موت ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ کہ COVID-19 کے تماشا کا حصہ بن جائیں۔ اپنی عقل کی حدود کو اور تیزی سے بڑھائیں اور طلوعِ اسلام کو اور مضبوط کریں کیونکہ یہی قرآنِ خالص کی آواز ہے۔ جس سطح تک قرآن کو بحیثیت نظام دین علامہ پرویز نے بیان کیا ہے کسی اور انسان نے ماڈرن دُنیا میں نہیں کیا کیونکہ ان سب کی عقل محدود تھی اور ہے۔ علامہ پرویز کے لٹریچر کی روشنی میں اپنی عقلی حدود کو خوب بڑھائیں اور ایک دوسرے کے قریب بھی آئیں۔ دوسروں کو اس کی روشنی میں روشناس کروائیں تاکہ مزید انسان اس کی طرف آئیں۔

(4) جب قرآن نے آیت (2:141) میں کہا تھا کہ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ ماضی میں لوگوں نے کیا کہا تھا یا کیا تھا تو اُس نے ایک عظیم نفسیاتی حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کر دی ہے۔ یہ جو تقلید کا معاملہ ہے یہی عقل کی حدود کو پھیلنے نہیں دیتا۔ اس طرح یہ ساری تاریخ اور احادیث وغیرہ عقائد بن کر انسان کی مکافاتِ عمل کو سمجھنے نہیں دیتے۔ جس سے انسان کا شعور ہر قسم کے غلط عقائد (Viruses) کی آماج گاہ بنا رہتا ہے اور یاد رکھیں یہ عقائد ہماری نفسیات کی بیماریاں ہیں۔ اس لئے اللہ نے اپنے اوپر ایمان کے لئے کہا ہے تاکہ وہ اور صرف وہ ہمارے لئے بحیثیت ماڈل ہونا چاہیے ورنہ دین والی عقل کبھی بھی نہیں ملے گی اور یہ بالکل انفرادی عمل ہے جو ہم میں سے انفرادی طور پر ہم نے خود کرنا ہے۔ یہی آیت (2:256) میں کہا گیا ہے۔ یعنی دین میں اکراہ نہیں ہے۔ ہم نے اپنی رکاوٹوں (ذہنی) کو خود دور کرنا ہے۔ (13:11)

آیت (2:141) میں ایک اور اہم بات ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا کہ ماضی کو اپنے لئے زنجیر نہ بننے دو تو اُس نے اپنے متعلق صاف طور پر کہہ دیا کہ اس کتاب کی موجودگی میں تمہیں ماضی سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اس لیے اپنا وقت مت ضائع کرو اور اس کتاب کی روشنی میں دین کا نظام وضع کرو اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق یہی تو علامہ پرویز نے کہا ہے۔ پورے کا پورا نظام تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ ابھی ہمارا کام ہے اور جو ہم کر رہے ہیں کہ اس کو سمجھ کر اپنی عقل کی حدود کو

(1) علامہ پرویزؒ کی کتب اور دروس نے کم از کم اس سمت میں ہمارے لیے بہت سی رکاوٹوں کو ہٹا دیا ہے۔

وسعت دیتے جائیں تو دین کا نظام نظریاتی اور عملی طور پر ہمارے سامنے آتا جائے گا۔ جوں جوں ہم اس کا احاطہ کرتے جائیں گے یہ ایک ممکنات کے طور پر ہمارے سامنے آئے گا اور ہم اس کی تشہیر بہتر طور پر کر سکیں گے اور سب سے اہم یہ ہے کہ طلوعِ اسلام کے Platform سے اس کو دوسروں کو سمجھا سکیں گے۔ یہ کام ہم پہلے بھی کر رہے ہیں یہاں صرف میں نے اعادہ کے طور پر لکھ دیا ہے تا کہ یہ تحریر میں آجائے۔ دوسروں کو بتانے سے بھی ہماری ذات پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے ہم وہی دوسروں کو بتائیں گے جس سے ہم نے خود استفادہ کیا ہے۔۔

(5) ابھی ایک اور اہم نقطہ کی طرف آتے ہیں جو کہ ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ اللہ کی ذات نے انسان کو شعور، عقل، خواہشات اور جذبات وغیرہ سے نوازا ہے۔ تو قدرتی بات ہے کہ وہ ان سب کو خود پوری طور پر سمجھتا ہے اور اُسے علم ہے کہ انسانی شعور کے بڑھنے سے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کا عمل یعنی دُنیا میں وحی کی روشنی میں اُن مقاصد کو حاصل کر لے گا جو کہ قرآن نے بیان کیے ہیں۔ اگر ہم اللہ کی ذات کو اُس کی صفات کے ساتھ اپنا ماڈل بناتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہمارا شعور اس کو Choose کر کے اپنے اندر مکمل طور پر جگہ دے دیتا ہے۔ تو اس کے بعد ہم عقل کو ایک مختلف سٹیج پر استعمال کریں یعنی ابھی عقل ایک خالص شعور کے نیچے کام کرے گی یعنی وہ شعور جس نے ایمان کو اپنے اندر جگہ دے دی ہے۔ اس سے جو نئی ذات ہم وجود میں لائیں گے تو یہ ہماری نئی زندگی ہوگی (29:64، 8:28) اسی نئی زندگی کو اللہ نے کہا ہے کہ اعمال صالح سے اُس سطح تک لے جائیں جہاں انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ دین کے نظام کو نہ صرف سمجھ جاتا ہے بلکہ اور مومنین کے ساتھ مل کر اُس کے مرتب کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ لامحالہ یہ خیال ہم میں سے کچھ کے ذہن میں پیدا ہوگا کہ ابھی تک ایسا کیوں نہیں ہوا؟ ظاہر ہے کہ ابھی اُس لیول کے مومنین جن کی عقل اُس حد تک بڑھ چکی ہو جو اللہ کے پروگرام میں شامل ہو سکتے ہیں تیار نہیں ہوئے۔ (24:55) میں ایمان اور اعمالِ صالح مشروط ہے مومنین کے ساتھ یعنی ایک جماعت کے ساتھ انفرادی نہیں ہے۔ یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے ہم قرآن کی تعلیم اور معیار کی روشنی میں اپنا انفرادی محاسبہ کر سکتے ہیں کہ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم دین کے نظام کو مرتب کر سکتے ہیں تو کیا اُس کے ضروری لوازمات سے ہم آگاہ ہیں؟ یہ ہم طلوعِ اسلام کی کنونشن کے دوران آپس میں Discuss کر سکتے ہیں۔ یہ ایک اہم نقطہ ہے جس کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

یہاں پر ایک چیز ہمیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ کہ کوئی بھی انسانی نظام مرہونِ منت ہوتا ہے اُن انسانوں کا جو کہ اس کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ مکافاتِ عمل کے مطابق یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان بہت اچھے کردار کے ہوں لیکن نظام کا نتیجہ غلط نکل رہا ہو۔ اس لئے ہمیں کبھی بھی شک کا فائدہ غلط انسانوں کو نہیں دینا چاہیے ورنہ ہم اپنی عقل اور شعور کو آگے بڑھنے میں مدد نہیں دے سکیں گے۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہم موجودہ نظام کو ہی کسی نہ کسی شکل میں ذہنی طور پر قبول کرنے کو تیار ہوتے ہیں مثلاً کہ اگر وزیراعظم یہ چند کام کر دے تو حالات بہتر ہو جائیں گے اگر یہ ہم جانتے ہیں کہ نظام بھی غیر دینی ہے اور اُس کو چلانے والا بھی غیر قرآنی! یاد رکھیں حق میں باطل کو Mix نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں عمران خان کی حکومت کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ اللہ کی حکومت کی بات ہو رہی ہے جو کہ صرف اور صرف اللہ کی کتاب پر مبنی ہوگی اور جو چند لوگوں کی بہبود کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کی

ضروریاتِ زندگی کا سوچے گی۔ اگر عقل اور شعور اس کو سمجھ نہیں سکتے تو پھر دین کی بات سمجھ میں نہیں آسکتی! میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ ہم کہتے تو اپنے آپ کو قرآنی لیکن اکثر دوسروں کو Judge کرتے ہوئے قرآنی معیار اور اقدار کو استعمال نہیں کرتے۔

اگر اللہ کی حکومت کے لئے کام کرنے کی ہم نے حامی بھری ہے تو عقل بھی تو اُسی لیول کی ہونی چاہئے؟ یا کبھی ہم نے دیکھا ہے کہ ایک CEO جو کہ ایک کامیاب ادارہ چلا رہا ہے۔ نکمے لوگوں کو بھرتی کرے گا؟ وہ ادارہ کچھ ہی دیر بعد ناکام ہوجائے گا۔ آج اگر امریکہ کو مسائل درپیش ہوئے ہیں تو وہ نااہل لوگوں کی وجہ سے ہی ہے۔ اور ہر نااہل لوگ اپنے سے پہلے نااہل لوگوں کی پشت پر سوار ہوکر یہاں تک پہنچتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ انسانی عقل اپنی خواہشات کے دائرہ سے باہر آ ہی نہیں سکی تو پھر وہ دوسرے انسان کی بہبود کا کیسے سوچے گی؟ آپ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو ایسا کیوں بنایا ہے؟ اس کا جواب ابھی تو قرآن نے دے دیا ہے۔ کہ اختیار وارادہ کا تقاضا ہے کہ آزادی بھی ملنی چاہیے ورنہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ پھر اگر یہ نہ ہوگا تو نئی زندگی والے انسان کہاں سے آئیں گے؟ اگر نئی زندگی والے انسان نہیں بن سکتے تو پھر یہ سلسلہ کائنات بے مقصد ہوجائے گا؟ پھر اگلی دُنیا جس کو ان نئی زندگی والے مومنین نے آگے لے کر جانا ہے وہ کیسے آگے جائے گی؟ یہ سارے سوالات اور ان کے جوابات ہماری عقل کو ملیں گے تو وہ ایک نئی دُنیا یہاں بنانے کا سوچے گی۔ یہ سب ممکنات کی دُنیا ہے صرف عقل کو اپنا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں اللہ اور اُس کی کتاب کی مدد ہمارے لئے ہر وقت موجود ہے۔ انسانی شعور کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ وحی کی روشنی اور اقدار میں شعور اپنے آپ سے پوری آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔ اس آگاہی میں ہماری زندگی کا راز ہے اور دین کو قائم کرنے کی چابی!

(6) جب ہمارے شعور کی اور عقل کی سطح بلند ہوتی ہے تو ہم یہ دیکھنا شروع کردیتے ہیں کہ محدود عقل والے انسان کس طرح دُنیا میں مسائل پیدا کرتے ہیں اور اُن کا محدود حل ڈھونڈتے ہیں۔ محدود اس لئے کہ وہ صرف اتنا ہی مسئلہ حل کریں گے جتنی اُن کی خواہش اور عقل کہے گی۔ یہ جو دُنیا میں ہم قومیت اور نسلی تفریق وغیرہ دیکھتے ہیں یہ سب اس کا نتیجہ ہے۔ قرآن ہمیں اس میں ایک اصول دیتا ہے۔ آیت (2:85) میں اُس نے کہا ہے کہ پہلے مسئلہ کھڑا کرو اور پھر خیرات لے کر کھڑے ہوجاؤ اور خیال کرو کہ میں نے بہت عظیم کام کیا ہے۔ دُنیا میں تمام مذاہب کی بنیاد اس نظریہ پر ہے جس میں انفرادی نجات کا عقیدہ اپنے گُل کھلاتا ہے۔ دین میں ایسی خودفریبی نہیں ہوتی۔ وہ حقائق کی بات کرتا ہے اور انسان کو واپس اُس کی بنیاد پر لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر بچہ اُسی طرح پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح میں خود پیدا ہوا تھا۔ اگر دُنیا کے ایک حصہ میں اُس برابر حیثیت والے بچہ کے لئے تھوڑے بہتر حالات ہیں اور دوسرے میں نہیں ہیں تو مومن کو اس کا پورا علم ہونا چاہیے۔ آپ (2:177) کو غور سے کئی دفعہ پڑھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایمان کے پانچ عناصر بتانے کے بعد اللہ نے کہا ہے کہ ضرورت مندوں اور مساکین کی مدد کریں اور صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور یہ مشکل کام ہیں لیکن اس میں ثابت قدم رہیں تو اس طرح عقل میں بہتری یعنی کشادگی اور بلندی آئے گی اور مذہب کے عقیدہ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس لئے مذہبی حضرات سے عقل کی کشادگی کی اُمید کم رکھیں پیغام دیں اور آگے نکل جائیں۔ جو انسان دوسرے انسانوں کے مسائل حل کرنے اور سمجھنے میں

دلچسپی نہیں رکھتا اور اللہ کے دینی نظام کی طرف آنے کو تیار نہیں اُسے ساتھ ملانے سے آپ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اِن کے متعلق کسی قسم کی سوچ رکھنے سے بھی قرآن نے منع کیا ہے اُس نے کہا ہے کہ زندگی جو دین کے لئے وقف ہے۔ اُس میں صرف وہ ہم راہ ہوں جو اُس سفر کو آسان بنا دیں اور کامیابی کے لئے کام کریں (25:63) قرآن ہماری آسانی کے لئے ہے نہ کہ ذہنی مشکل میں اضافہ کے لئے (20:1) عقل اتنا بہتر کام کرتی ہے جتنا اُس پر کم نفسیاتی بوجھ ہوگا۔ اس لئے قرآن کی روشنی میں اپنے شعور اور عقل کی صفائی کرتے رہیں شعور میں جب اللہ کی ذات کا ماڈل اس طرح بن جائے جس طرح قرآن نے ایمان اور اعمالِ صالح کے ذریعہ بنانے کو کہا ہے تو انسانی شعور اس آزادی سے روشناس ہو جاتا ہے۔ جس سے آگہی اُس کو دین کی اہمیت سے آگاہ کر دیتی ہے۔

(7) قرآن نے جب (5:101) میں کہا تھا کہ اس قرآن میں ہر وہ بات شامل کر دی جائے گی جس کی انسان کو کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ضرورت ہے۔ اس لئے اگر کوئی چیز یا بات قرآن میں نہیں ہے لیکن زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اُس کی ضرورت ہے تو مومنین باہمی مشورہ سے اُس کے متعلق فیصلہ کر کے اُس کو اپنے نظامِ حکومت میں شامل کر سکتے ہیں۔ لیکن اُس میں ایک اہم بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ قرآن کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو اور قرآنی اقدار کے اندر ہو ورنہ اس کا مکافاتِ عمل کے قانون کے مطابق نقصان ہوگا چاہے وقتی طور پر وہ کتنی ہی جاذبِ نگاہ کیوں نہ ہو (5:44) یہ اصول اہم ہے اور عقل کو اس حد تک ترقی یافتہ ہونا چاہیے کہ وہ اس کی اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ قرآنی تعلیم اُس کی بہتری کے لئے ہے اور اُس کی اقدار کے خلاف جانا خودکشی کے مترادف ہے اور شعور کی غلامی مول لینا ہوگا جوں جوں عقل اپنی کشادگی کو محسوس کرے گی وہ قرآن کے اور نزدیک آتی جائے گی اس لئے کہ جو آزادی ہمیں شعور کی سطح پر قرآنی عقل سے ملتی ہے وہ کبھی بھی اُس عقل سے نہیں مل سکتی جو کہ خواہشات اور مذہب کی قید میں رہ کر زندگی گزارتی ہے۔ یہ ایک اہم نقطہ ہے جس پر دین کے نظام میں تربیت کی ضرورت ہوگی۔ ایسے شعور تیار کرنے میں تربیت دی جائے جو مکمل طور پر آزادی کے خوگر ہو جائیں پھر وہ کبھی غلامی قبول نہیں کریں گے۔

(8) ہم نے اب تک چند نکات پر بحث کی ہے جن سے عقل کی حدود بغیر قرآن کی روشنی اور عقل کی کشادگی قرآن کی روشنی میں سامنے لائی گئی ہیں۔ ابھی میں یہاں چند مثالیں پیش کروں گا جو کہ قرآن نے ہماری رہنمائی کے لئے قرآن میں Quote کی میں قرآن جب انبیاء کرام علیہم السلام کی مثالیں دیتا ہے تو اُس کا مقصد اُن کو بطور انسانی ماڈل ہمارے سامنے پیش کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اگر بحیثیت انسان یہ کر سکتے تھے اور دین کے نظام کے لئے کوشاں رہے تو انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم سب ایسا کر سکتے ہیں۔ کہیں بھی قرآن نے نہیں کہا کہ ہم ان کے پیرو نہیں ہو سکتے بلکہ عام مومنین کو کہا ہے کہ اُن کی مثالوں میں ہمارے لئے سبق ہے تا کہ ہم اللہ کے ساتھی بنیں اور انسانی زندگی کو بہترین طور پر گزار سکیں اور آخرت میں مزید منزلیں طے کرنے کے قابل ہو جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی قرآن میں بہت تفصیل سے آئی ہے شاید ہی کوئی زندگی کا گوشہ ہوگا جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے وہ سارے گوشے قرآن سامنے لے کر آیا ہے جو کہ ایک مومن اور مسلم بننے

میں مدد دیتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی انفرادی اور اُن کا کردار ایک اجتماعی زندگی میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس میں وہ بحیثیت انسان اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ پرویز صاحب نے ''معراجِ انسانیت'' میں ان سے متعلق گفتگو تفصیل سے کی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایک اور ماڈل ہیں جن کا ذکر قرآن نے انفرادی طور پر کیا ہے۔ اتنے مشکل حالات میں بھی اُنہوں نے وحی کی اقدار کا دامن نہیں چھوڑا اور آخر کار وہ اس قابل ہو گئے کہ اللہ کی مخلوق کے زیادہ کام آسکیں۔ اسی طرح اور بھی انسانی ماڈل قرآن نے پیش کئے ہیں اور اُن کے بعض اہم گوشے ہمارے سامنے لائے ہیں تاکہ ہم اُن سے یہ بات سمجھ لیں کہ جس طرح اُنہیں اللہ کی مدد حاصل تھی اِسی طرح مجھے اور آپ سب کو اللہ کے قوانین کی کی مدد حاصل ہے اگر ہم اُس راستہ کو اپنالیں جو کہ قرآن نے ہماری عقل کے لئے تجویز کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم نے فیصلہ کرلیا ہوا ہے کہ ہمارے لئے قرآنِ خالص کافی ہے۔ یہ ہماری اپنی عقل کا فیصلہ ہے اور اس فیصلہ میں ہم نے خود عقل کی محدودیت کو پہچان کر کہا ہے کہ ہم اپنی عقل کو کشادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے بعد ابھی ہم نے عقل کی کشادگی کو اس سطح پر لانا ہے۔ جہاں ہم دین کے نظام کو انفرادی اور اجتماعی طور پر قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ظاہر ہے یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اس پر اجتماعی طور پر کچھ کام شروع ہو۔ ابھی تو شاید اس کے لئے حالات Favourable نہیں ہیں کیونکہ دُنیا میں انسان یا تو عقل کے ہاتھوں ابھی تنگ نہیں آئے یا پھر مذہبی لوگ ہیں جنہوں نے عقل کے استعمال کو بند کر دیا ہوا ہے۔ جونہی قرآن خالص کی بات ہوتی ہے۔ وہ اس کو اُن کے اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ جو کہ ہمارے لئے قابلِ فہم ہے۔ حالات اور خراب ہونے دیں پھر ہم سب حضرات خود بخود سننے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ جسے برادران یوسف تیسری دفعہ جب آئے ہیں تو پھر یوسف علیہ السلام کی بات بھی اُنہوں نے سنی اور اپنی غلطیوں کا اعتراف بھی کیا۔

(9) آخر میں ضروری محسوس کرتا ہوں کہ ایمان اور اعمالِ صالح پر تھوڑی سی روشنی ڈال دوں کہ میری نظر میں قرآن نے اس پر کیوں اتنا زور دیا ہے۔ ظاہری طور پر یہ بہت آسان اور سیدھا سادہ کام نظر آتا ہے کہ 5 حصوں پر ایمان لے آیا جائے اور پھر اعمالِ صالح کر دیئے جائیں یا کرتے جائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے ہوتا کیا ہے اور اگر وہ نہیں ہو رہا تو پھر ہمیں دوبارہ گہری نظر سے دیکھنا چاہئے کہ کہیں فارمولا میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے؟

قرآن کا ایمان عقیدہ (Belief or Faith) نہیں ہے یہ ایک یقین ہے جس سے ہر فرد اپنی کوشش سے خود اس حقیقت پر پہنچا ہے کہ انسانی زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وحی کی ہدایت کی ضرورت ہے۔ ایمان کے لئے انسان کو ایک Process سے گزرنا چاہیے جس میں انسانی مسائل اور اُن کا حل شامل ہونا چاہیے ورنہ انسان ''اپنی نجات'' میں پڑ جاتا ہے جو کہ خالصتاً مذہب کی دُنیا کا حصہ ہے۔ اس کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے تاکہ اجتماعی فائدہ جس کا تعلق انسانیت کے ساتھ ہے ہر وقت ہمارے شعور میں رہے۔

دین کے نظام کا قیام ہمیشہ فرد سے شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ جب بھی یہ نظام قائم ہونا شروع ہوگا یا ہوتا ہے۔ ہر فرد کی انفرادیت کو ہمیشہ ذہن میں رکھیے گا۔ کسی ایک فرد کی بھی اگر اس نظام میں توہین ہوگی تو یہ دین کا نظام نہیں رہے گا۔ اسی کو تو قرآن

نے کہا ہے کہ ایک انسانی نفس کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے (5:32) یہ انسانی ذات کی سطح کی بات کی ہے یعنی کسی کو ناحق قتل کر کے اُس کی ذات کی نشوونما کا موقع اُس سے چھین لیا جاتا ہے یہ ایک الگ موضوع ہے جو کہ تفصیل چاہتا ہے (دین کے نظام میں نفس اور طبیعی زندگی دونوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ نفس کی اہمیت صرف اور صرف دین کا نظام پوری کر سکتا ہے۔ یہ غیر قرآنی نظام کے بس کی بات نہیں ہے) ایمان کا تعلق انسانی ''I'' یعنی ''میں'' اور شعور کے ساتھ ہے اور انسان کو اپنے ارادہ سے بالکل آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کون سے نظریہ کے تحت گزارنا ہے۔ یہ خالصۃً اُس کا اپنا فیصلہ ہے اور اس میں زبردستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ فیصلہ کوئی نفس آزادی سے کرتا ہے تو اس سے جو تبدیلی اُس کی نگاہ میں آتی ہے اُس کا علم اُسے خود بھی اچھی طرح سے ہوجاتا ہے کیونکہ وہ اب دُنیا کو قرآن کی روشنی میں دیکھنے کا خواہش مند ہوجاتا ہے۔ یہ ایک اہم نقطہ ہے کہ ایمان اُسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ہمارے اندر خواہش موجود ہے کہ میں اس ایمان کو نہ صرف رکھنا چاہتا ہوں بلکہ اُس کو جاری رکھتے ہوئے وقت کے ساتھ زیادہ مضبوط بھی بنانا چاہتا ہوں جس کے لئے قرآن ہمیں اعمالِ صالح کی طرف بلاتا ہے۔ ایمان باتوں سے مضبوط نہیں ہوتا اعمال بے حد ضروری ہیں کیونکہ ہمارے خیالات ہی تو اعمال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرا نقطہ یہ ہے کہ ایمان سے ہی تو ہم نے اُن مسائل کو حل کرنا ہے جو کہ بغیر ایمان والوں نے انسانوں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ اگر ہمارا ایمان اس قابل ہی نہیں کہ اُن مسائل کو سمجھ سکے تو اُس نے حل کیا خاک کرنا ہے؟

چونکہ مکافاتِ عمل کے قانون کے مطابق ہمیں اسباب اور عقل دونوں کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہوتا ہے کہ انسانی دُنیا کے انفرادی اور مجموعی حالات کیسے ہیں۔ اس لئے ایمان ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے ہم یہ بھی دیکھ سکیں کہ دُنیا کے موجودہ حالات کس طرف جارہے ہیں اور یہ بھی کہ وہ کونسے اسباب ہیں جنہوں نے ماضی میں ان اثرات کو جنم دیا ہے۔ ان اسباب کے پیچھے کونسی انسانی سوچ کام کررہی تھی اور آج کیا سوچ کام کررہی ہے جس کی وجہ سے یہ مسائل یا حل ہمارے سامنے آرہے ہیں جو بھی انسان جان بوجھ کر مسائل پیدا کرتے ہیں اگر ہم اپنے ایمان کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں تو ہم اُن کے ایمان کو بھی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس سے ہم دو چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ (ا) ہم اُن کی ذہنیت کو سمجھ جاتے ہیں اور اُن کو بتا سکتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کررہے ہیں۔ (ب) دوسرے اُن کا سدِباب کر سکتے ہیں۔

اگر ہمارا ایمان اُس حد تک ترقی یافتہ نہیں ہے۔ تو ہمیں اُس کی حدود کو بڑھانا چاہیے۔ محض بنیادی ایمان حاصل کر کے تسلی سے نہیں بیٹھ جانا چاہیے کہ اب مذہب کی طرف میری نجات ہوگئی ہے۔ مجھے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بار پھر ذہن میں یا شعور میں رکھ لیں کہ اُس درجہ کا ایمان حاصل کریں جو کہ دین کے نظام کو سمجھنے میں درکار ہوتا ہے۔ اور جس سے دین کا نظام قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کے لئے اپنی عقل کو یقین دلانا ضروری ہے۔ اور اگر انسانی عقل کسی کام پر خوشی سے راضی ہوجاتی ہے تو پھر انسان کبھی بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرے۔

اس مضمون کے سلسلہ میں کوئی رائے ہو یا کوئی سوال ہو تو اس پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ erasool@aol.com

یا پھر ادارہ طلوعِ اسلام کو آگاہ کردیں۔ وہ مجھے اطلاع کردیں گے۔ شکریہ (اعجاز)

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر1)

اللہ کا مخلوق کے بطورِ خالقِ کُل مقتدرِ مُطلق کا تصور

زمانۂ قدیم سے ہوش سنبھالتے ہی اِنسان کے دِل میں یہ سوال پیدا ہوتا رہتا ہے کہ ہمیں کس نے تخلیق کیا ہے اور ہماری ربوبیت/ پرورش کون کر رہا ہے۔؟ سب سے پہلے ہمارا ذہن اِس طرف جاتا ہے کہ ہمارا خالق ہم سے بہت زیادہ طاقت رکھتا ہوگا۔ آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گزریے اور روئے زمین کی کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے، ایک چیز آپ کو بلالحاظ زمان و مکان، بالعموم تمام نوع انسانی میں مشترک نظر آئے گی، یعنی کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی فوق البشر قوت کا احساس ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی قوت کا احساس ہر جگہ موجود ہے، اس کا تصور اور اس کی تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ ایک ہی ملک میں ایک قبیلے میں اِس بلند و بالا ہستی کا تصور دوسرے قبیلے کے تصور سے نہیں ملتا۔ آئن سٹائن ذاتی خدا کے تصور سے نا آشنا تھا، اس کے برعکس وہ یہ کہتا تھا کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے محدود وسائل کی مدد سے کارخانہ قدرت کا راز جاننے کی کوشش کرے، پھر اُسے پتہ چلے گا کہ اس تمام سلجھی ہوئی ڈور کے پیچھے نہایت لطیف انداز میں ایک غیر مادی اور نہ سمجھ میں آنے والی قوت کارفرما ہے، اس قوت کی ستائش اور تکریم، جو ہمارے فہم سے ماورا ہے، ہی میرا مذہب ہے!

انسان کہاں سے آیا، کیوں آیا اور کہاں جائے گا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب مذہب تو دیتا ہے مگر سائنس ان جوابات کو تسلیم نہیں کرتی۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا یعنی کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت) کا خیال پیدا کیسے ہوا۔ مغرب کے علمائے عمرانیات کا (آج سے کچھ عرصہ پہلے تک) یہ خیال تھا (اور اب بھی وہاں اس خیال کے موید لوگ ملتے ہیں کہ) جب ابتدائی دور کے انسان نے (جب اس کا شعور ہنوز عہد طفولیت میں تھا) یہ دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں جن کے علل و اسباب کا اسے کوئی پتہ نہیں چلتا (مثلاً بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، طوفانِ بادوباراں، زلزلے، وبائی امراض وغیرہ) تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو ان حوادث کے پیچھے کوئی بڑی بڑی قوتیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ اس سے اس کے ذہن میں ''خدا'' (دیوی، دیوتاؤں) کا تصور پیدا ہوا۔

اللہ کا بطور خالقِ اِنسانی ذات کا تصور:

خدا کی غیر مرئی قوتیں کے لئے عمومی طور پر اَلِہَ۔اِلَیۡہِ۔یَأۡلَہُ کے الفاظ بولے جاتے تھے جس کے معنی ہیں گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا متحیر ہونا ہیں۔ اَلَہَ۔یَأۡلَہُ کے معنی یہ بھی ہیں کسی کو پناہ دینا، امان میں لینا۔ ان معانی کے اعتبار سے "اِلٰہٌ" کے

معنی ہوں گے ایک ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے جس سے مشکلات دور کرنے کی استدعا کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصور سے انسان متحیر ہو جائے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''لَاہَ بَلِیْہُ'' سے مشتق ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ''اَلَہَ'' کے معنی ہیں وہ شخص غلام بن گیا اور ''اَلَّھَہٗ'' کے معنی ہے کہ اُس نے اسے غلام بنالیا۔ اس اعتبار سے ''اِلٰہٌ'' کے معنی ایسی ہستی ہوں گے جس کا غلبہ و اقتدار اختیار کیا جائے جس کے قانون کی اطاعت کی جائے جس کی محکومی اختیار کی جائے۔

آپ غور کیجئے کہ ذہن انسانی نے ''معبود'' کے جس قدر تصورات بھی قائم کیے ہیں، ان میں مندرجہ بالا خصائص کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ ان کا بلند و بالا ہونا، نگاہوں سے پوشیدہ ہونا، اس کے تصور سے حیرت زدہ ہو جانا، مشکلات سے گھبرا کر اس کی طرف مدد کے لیے رجوع کرنا، تذلل و تعبد سے اس کے سامنے جھکنا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ بالفاظ دیگر "اِلٰہٌ" وہ جامع لفظ ہے جو "خدا" کے ہر قسم کے تصور کو محیط ہے۔ اس طرح انسان کے ذہن میں "خدا" کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے ماحول و کوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا اور انسان ترقی کرتا گیا اس تصور میں بھی جلا پیدا ہوتا گیا۔ اس طرح بتدریج ''خدا'' کا وہ تصور وجود میں آ گیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کو اللہ کا ارتقائی نظریہ کہا جاتا ہے۔ مشہور یونانی مورخ، پلوتارک (PLAUTARCH-AD 42-107) اس باب میں لکھتا ہے:

زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے

1۔ جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ 2۔ ایسے بھی جن میں علم کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔

3۔ ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں۔ 4۔ ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں نہ ورزش گاہیں، نہ تھیٹر

اِس کے باوجود تم اِن میں سے کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں، جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں، جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں۔

ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

جس قسم کا خدا کا تصور کسی کے ہاں ہوگا، اسی قسم کی اس فرد کی زندگی اور اس جماعت (یا قوم) کا معاشرتی نقشہ ہوگا۔ یہ غالباً مغربی مفکر کانٹ تھا جس نے کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے کس قسم کا معبود پرستش کے لیے اختیار کر رکھا ہے اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔

مذاہب کی دنیا میں اہلِ کتاب میں الٰہ کا تصور:

مذہب کی بنیاد ہی خدا کے ایمان پر رکھی جاتی ہے۔ مختلف مذاہب میں خدا کا نام بدل جائے گا لیکن اس کی ہستی کا اقرار، اس پر ایمان، ہر جگہ شرط اولین ہوگا۔ اس سے لازماً یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ سوالات جیسا کہ ظاہر ہے بڑے اہم،

بڑے مشکل اور بڑے نازک ہیں اور جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ان کے اطمینان بخش جواب کے لیے مصروفِ تحقیق وکاوش ہے۔

اہل کتاب میں یہودیت میں اسرائیل کے بادشاہ فرعون نے کہا کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ ''اس سے الٰہ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوت یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومی سے نکال کر آزادی کی فضا میں بسایا جائے، جہاں وہ خالص خدا کے احکام کی اطاعت کریں۔ فرعون کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی مملکت میں اطاعت وفرماں پذیری اسی کی ہوسکتی ہے، اس لیے بنی اسرائیل کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی اور کے قوانین کی پابندی اختیار کرلیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک یہی نہیں کہ انسان پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو، اس سے کہیں بڑا شرک یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی جگہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کی اطاعت کرے۔

اہلِ کتاب میں عیسائیت میں خدا کے تصور میں تثلیث کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔ عیسائی تین خدا مانتے ہیں: باپ، بیٹا، روح القدس۔ یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ (5:73)

''بلاشبہ وہ لوگ (حق سے) منکر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں ایک کا ہے۔ حالانکہ بجز اس ایک الٰہ کے اور کوئی الٰہ نہیں۔''

یونان کے اقنون ثلاثہ کا عقیدہ جو آریہ ورت میں آکر روح، مادہ اور خدا کا عقیدہ بنا، وہ بھی تبعاً اسی میں شامل ہے۔

اہل کتاب نے مذہبی احبار ورہبان، علماء ومشائخ کو خدا کا شریک بنالیا تھا۔ یہ عقیدہ انسانی عظمت وتقدس کا نقاب اوڑھ کر عقیدت وارادت کے راستے رگ وپے میں سرایت کرجاتا ہے اور کچھ اس طرح دل کی گہرائیوں میں اپنا گھر بنالیتا ہے کہ اس سے باہر نکلنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (9:31)

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء ومشائخ کو خدا بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ وہ اسی ایک الٰہ کی عبودیت اختیار کریں جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ وہ ان کے شرک سے بلند ہے۔''

دیگر مذاہب میں خدا کے توحیدی تصور کے برعکس شرک کا داخلہ:

اہلِ کتاب سے علیحدہ دیگر مذاہب میں مجوسی (پارسی، جو اپنے آپ کو جناب زرتشت کے پیرو کہتے ہیں) دو مستقل خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا، ایک برائی کا، ایک نور کا خدا، ایک ظلمت کا۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمادی۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (16:51)

''اور اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ دو الٰہ اختیار نہ کرو، الٰہ وہی ایک ہے۔ سو تم لوگ صرف اسی کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خوف کھاؤ۔''

اِس میں شبہ نہیں کہ بعض مذاہب، مثلاً بدھ مت، ایسے ہیں جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں لیکن خود بدھوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مہاتما بدھ کی خدا کی طرح پرستش کرتے ہیں، سوفرق صرف نام کا ہے، تصور ہر جگہ وہی ہے۔

ان محسوس شکلوں کے علاوہ قران کریم شرک کی ایک ایسی شکل بیان کرتا ہے جسے انسان کی آنکھ بھانپ نہیں سکتی تھی۔ اس غیر محسوس شے کو شرک قرار دینا صرف اس خدائے علیم وبصیر کا کام ہے جو دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے کہ

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (45:23)

''کیا تو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا الٰہ بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون خداوندی نے اسے باوجود علم کے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں پر اور قلب پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح راستہ کی طرف راہ نمائی اللہ کے قانون کے مطابق ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیا تم پھر بھی نصیحت نہ حاصل کرو گے؟''

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایک سے زیادہ الٰہ مقرر کر لینے سے فساد رونما ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ آج یہ جو ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو رہا ہے تو کیا اس کی یہی وجہ نہیں کہ ہر انسانی قلب، صنم کدہ بن رہا ہے؟ ہر گروہ اور ہر قوم اپنی اپنی خواہشات کو خدا بنائے بیٹھی ہے اور اس ''خدائے خواہشات وجذبات'' کے تغلب وتسلط میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ قرآن کے مطابق یہ شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی ہے جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جا گرتا ہے۔ مذاہب کی دنیا میں ہر مذہب میں اعتقادی دعوؤں کے حق میں کوئی ایک بھی علم کی سند پر تسلی بخش ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ عیسائی سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت آگے کر دے گا، کسی ہندو سے پوچھیں تو وہ اپنی کتابیں آگے کر دے گا، کسی مسلمان سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت پیش کر دے گا۔ سب کی ایک ہی بات کہ ہماری کتاب خدا نے ہدایت کیلئے بھیجی۔ سب کی اپنی اپنی تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے اپنے خدا کو اپنے دعووں کے حق میں ثابت کرتے ہیں۔ اُن کے سامنے کوئی خدائی علم کی راہنمائی نہیں، بلکہ انسان خود اپنی طرف سے پیش کردہ تاویلات سے خدا کے وجود کو منوا رہا ہے۔ بہرحال یہاں کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ جس پر چل کر خدا کو مانا جائے اور منوایا جائے۔ صرف معجزات وعقائد کے چند وہم ہیں، جو خوف کی صورت میں خدا پر ایمان رکھنے کے موجب بنے ہوئے ہیں۔ اگر مقصود اللہ کی حقیقت وصداقت مطلوب ہے، تو اُس تک رسائی کے راستے معجزات وعقائد کی راہنمائی میں طے نہیں کئے جا سکتے، بلکہ غور وفکر سے عقلی وعلمی صلاحیتیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ خدا:

زمانۂ قدیم میں اِنسان اپنے ذہن سے تراشید کر کے خدا کے اِنسانی تخلیق پر قادر ہونے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اِس کے لئے اُس کے ذہن میں اِسی قسم کے سوالات جنم لیتے رہتے کہ اگر انسان کے دو ہاتھ ہیں، تو خدا کے چار ہاتھ ہوں

گے۔ اگر انسان ایک پتھر اُٹھا سکتا ہے تو خدا ایک پہاڑ اٹھالے گا۔ انسان کا قد پانچ چھ فٹ کا ہوتا ہے، خدا کا قد پچاس ساٹھ فٹ کا ہوجائے گا۔ ہندوستان کے دیوی دیوتا اور اصنامیات یونان کے مجسمے اسی تصور کے مظاہرات ہیں۔ انسان کا ذہن، انسان اور مظاہر فطرت سے الگ ہوکر خدا کا کوئی تصور پیدا کرنے کا اہل ہی نہیں ہوا تھا۔

ویدوں میں خدا کا تصور ہے کہ برہمن اس کے منہ سے (پیدا) ہوئے اور اس کے بازوؤں سے کشتری ذات کے لوگ پیدا ہوئے جو ویش ہیں، وہ اس کی ٹانگوں سے پیدا ہوئے اور پرمیشور کے دونوں پاؤں سے بیچارے شودر پیدا ہوئے۔ چاند اس کے منہ سے پیدا ہوا اور آنکھوں سے سورج پیدا ہوا۔ منہ سے اندر اور اگنی دیوتا پیدا ہوئے اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی! وہ سانپوں، اُسترے اور بخار کو سجدہ کرتے بھی دکھائی دئے جاتے۔ اوتار کا عقیدہ بھی انسان کے اسی رجحان کا آئینہ ہے اس نے جہاں کسی انسان میں کوئی ایسا جوہر دیکھا جو عام انسانوں میں کم ملتا ہے اسے فوراً فوق البشر کی شکل میں خدا تصور کرلیا

قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا خدا کی طرف سے بوساطت انبیائے کرامؑ، وحی کے ذریعہ نوعِ اِنسانی کی طرف رہنمائی آنا شروع ہوگئی۔ ہر نبی کی طرف سے راہنمائی کا نقطہ ماسکہ خدا کے نظریہ توحید کا تھا، لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس بلند و بالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ کبھی وہ ان چیزوں کو اپنا معبود بنالیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا، کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔ کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت و تقدیس کے پیش نظر ان کے مجسمے کھڑے کرتا، بت تراشتا چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا، اندر، اگنی، سورج، چاند، گنگا، جمنا، سانپ، گائے، بیل، سب اسی جذبہ خوف و امید (یعنی دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ جب ذہن انسانی پر اس طرح توہم پرستی کی تاریکیاں چھا جائیں تو پھر ایک اور رسول آجاتا اور خدا کے پاکیزہ توحید کے تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انہیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان اشیائے کائنات کا مسجود ہے، ساجد نہیں۔ اس میں ایسی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی رو سے یہ اشیائے فطرت کو مسخر کرسکتا ہے اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود ذہن، لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ خدا تو بہت بڑی چیز ہے۔ دور حاضر کے مفکرین اور سائنسدان ہمیں بتاتے ہیں کہ زمان کی کوئی ابتدا نہیں اور مکان کی کوئی حد نہیں۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ زمانہ فلاں وقت سے شروع ہوا اور کائنات کی فضا کا آخری کنارہ وہ ہے۔ نہ زمانہ کا کہیں سے آغاز ہوا، نہ فضا کا کوئی آخری کنارہ ہے۔ فلسفہ اور سائنس ہمیں یہ بتاتے ہیں، لیکن آپ اپنے ذہن پر زور ڈالئے اور ایک ''لا ابتداء'' یا ''لا انتہا'' مکان کا تصور قائم کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ذہن میں ان کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ آپ جتنا زیادہ ذہن پر زور ڈالیں گے اتنی ہی جلدی آپ جھنجلا اٹھیں گے۔ سو جب زمان اور مکان کے تصور کی یہ حالت ہے، تو خدا کی ذات کا تصور (جو زمان و مکان کا خالق ہے) کس

طرح انسان کے حیطہ ادراک میں آسکتا ہے؟

اللہ کے وجود کے بارے میں سوال پوچھنے والے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کائنات ازخود کیسے وجود میں آگئی ہے؟ اس کا تو ضرور کوئی خالق ہوگا، جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس دلیل سے خدا کو ماننے والے سمجھتے ہیں کہ ہم خالق تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کے بعد دوسری طرف سے اعتراض آتا ہے کہ جب تم خود مانتے ہو کہ بغیر خالق کے کوئی شے وجود میں نہیں آسکتی تو پھر جسے تم خالق کہتے ہو، جسے تم خدا کہتے ہو، وہ پھر بغیر خالق کے کیسے وجود میں آگیا؟۔ اِس سبب کو ڈھونڈنے کی تلاش میں تدریجی مراحل طے کرتے ہوئے وہ اللہ کے دیئے ہوئے نظریہ ارتقاء ہی سے اِس کا حل ڈھونڈنے میں مجبور ہوجاتے ہیں۔

قدیم یونانی حکماء نے اپنے زمانہ پر محدود عقل کا استعمال کرتے ہوئے اُس وقت کے علم کی روشنی میں دیوی، دیوتاؤں کے تصورِ خالقِ کائنات سے لوگوں کو چھٹکارہ دلوایا۔ عقلی توجیہات سے بطور خالقِ کائنات اللہ کا تصور پیش کرنے کا سہرا تھالیس کو جاتا ہے۔ وہ آج سے 26 سو سال کے لگ بھگ ہمارے دور سے پیشتر 624 قبل مسیح پیدا ہوا اور 556 قبل مسیح فوت ہوا۔

قدیم یونانی فلاسفروں کا نظریہ ارتقاء:

فلسفہ کے علم کی ابتدا کا سہرا تھالیس (Thales) کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ وہ آج سے 26 سو سال کے لگ بھگ ہمارے دور سے پیشتر 624 قبل مسیح پیدا ہُوا اور 556 قبل مسیح فوت ہوا۔ اصولی طور پر اُس نے یہ نظریہ دیا کہ تمام مادی اشیاء کا بنیادی مادہ پانی ہے اور یہ کہ ہر چیز پانی سے نکلی ہے اور آخر کار دوبارہ پانی میں مِل جائے گی۔

انسانی تاریخ میں یہ پہلا ثبوت اور کوشش تھی کہ کائنات کو کسی خیالی یا تصوراتی طریقے پر بیان کرنے کی بجائے کائنات کی حقیقت کو فطری اور سائنسی طریقے پر انسانی مشاہدہ سے ثابت کیا جائے۔

اُس کے بعد اناکسی مینڈر (Anaximander) کا تصور سامنے آتا ہے جو تھیلس کے اس اصول سے مُتفق تھا کہ مادی اشیاء کا بنیادی یا حتمی اصول مادہ ہی ہے، لیکن اس نے مادہ کو پانی کا نام نہیں دیا۔ اُس کے خیال میں اشیاء کا اصول جامد مادہ تھا وہ بے صورت، غیر متعین اور لامحدود تھا، جو مُختلف مراحل سے گزر کے مُختلف اشکال اختیار کر لیتا تھا۔

اُس کے بعد اناکسی مینیز (Anaximenes) نے اپنے پیشرو کی طرح بے صورت، غیر متعین، لامحدود اور بے نام مادے کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ اُس نے کائنات اور مادی دنیا کا بنیادی اصول ہوا کو قرار دیا۔ اُس نے کہا کہ یہ ہوا بھی غیر متعین مادے کی طرح خلا میں پھیلی ہوئی ہے اور مسلسل حرکت میں ہے۔ یہی حرکت کا اصول ہوا کی بنیادی فطرت میں موجود ہے اور یہی اصول کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے ارتقاء کا باعث بنا ہے۔

اِس مسلہ کا حل فیثاغورث (Phythagoreas) نے یوں پیش کیا ہے کہ

مُختلف چیزوں کے خواص میں اتنے زیادہ اختلاف ہونے کے باوجود ان سب میں ایک صفت یا خاصیت آفاقی نوعیت کی پائی جاتی ہے جو کائنات کی ہر چیز میں یکساں موجود ہے، چاہے وہ چیز مادی یا تجریدی (خیالی) ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں عددی ہیں اور یہ کہ اُن کو گِنا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں کسی ایسی کائنات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جس میں ''ہندسوں'' اور تعداد کا تصور نہ ہو۔ فیثا غورث کا کہنا تھا کہ کسی ایسی کائنات کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، جس میں رنگ، ذائقہ نہ ہو اور بے وزن ہوں لیکن کسی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں ہندسوں کا وجود یا ضرورت نہ ہو یا تعداد کا بالکل تصور ہی نہ ہو۔ یہی دنیا کے وجود میں آنے کے بنیادی اصول کا اہم ترین پہلو ہے۔

ہراکلیٹس 535 قبل مسیح میں پیدا ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی وفات 475 قبل مسیح ہوئی ہے۔ اُس کے بقول ''تمام اشیاء آگ سے وجود میں آئی ہیں اور اسی میں واپس مِل جائے گی۔''

ہُراکلیٹس کا نظریہ تھا کہ آگ دراصل تغیر کی صورت ہے، اِس لئے تغیر و تبدیل کا عمل ہی حقیقی ہے۔ اس کے برعکس وجود یا مُستقل صورت کا قیام سب فریبِ نظر ہے۔ اُس کا مشہور قول ہے کہ حرکت اصل حقیقت ہے۔ دنیا کی ہر چیز مسلسل تغیر و تبدیل کے عالم میں ہے اور نئی نئی صورتیں اختیار کر رہی ہیں۔

ہراکلیٹس کہا کرتا تھا کہ چیز بظاہر یعنی باہر سے اگر ویسی ہی ہو جیسے پہلی تھی تو یہ صِرف اس کے مادے کے حُجم کی وجہ سے ہے لیکن اصل مادہ پہلے والا نہیں رہتا بلکہ بہتے دریا کے پانی کی طرح بدلتا رہتا ہے۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ مادے کی مُختلف قسموں کی بنیاد فطری طور پر ایک ہی مادہ ہے تو پھر مادے کی موجود عناصر یعنی ہوا، پانی، آگ اور مٹی کی مُختلف خاصیتوں کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ پھر یہ بظاہر مُختلف خاصیتیں ایک خاص یا مخصوص خاصیت کیسے اپنائیں گی۔ طبیعین کے نزدیک آگ و آب و خاک و باد (عناصرِ اربعہ) کائنات کے اساسی اجزاء ترکیبی ہیں۔

نظریہ ارتقاء کا آغاز فلسفہ مادیت سے ہوتا ہے جس کا ابوالآباء دیمقراطس کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شے جواہر سے بنی ہے اور جواہر از روئے ہندسہ نہیں بلکہ مادی طور پر نا قابل تقسیم ہیں۔ ان قدیم مادئین کا خیال تھا کہ کچھ بھی ہو، یوں ہی (اتفاق سے) نہیں ہوتا بلکہ ہر بات کسی سبب کے باعث ہوتی ہے۔

وہ جواہر کو لایتجزیٰ کہتے ہیں اس نظریہ کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ:

(1) یہ تمام لایتجزی اجزا مادی ہیں۔ (2) ہر شے انہی ذرات سے مرکب ہے۔

(3) جب یہ باہم مل کر کسی شے کو ترتیب دیتے ہیں، تو ان کے درمیان خلا رہ جاتی ہے۔

(4) یہ ذرات نا قابل فنا ہیں۔ (5) یہ ہمیشہ سے حرکت میں ہیں اور ہمیشہ حرکت میں رہیں گے۔

(6) جواہر تعداد میں لامحدود ہیں۔

(7) تمام اقسام کے جوہر کی نوعیت ایک ہی ہے۔ ان میں فرق صرف شکل اور جسامت کا ہے۔

(8) نفس انسانی بھی انھیں اجزاء سے مرکب ہے اور انسانی فکر ان ہی اجزاء کی طبعی ترتیب سے ظہور میں آتا ہے۔

عصرِ جدید میں بھی حکمائے مغرب تخلیقِ کائنات کی گتھیوں کو سُلجھانے میں لگے رہے، لیکن سمپسن کا نظریہ ارتقاء کا آغاز اِس سوال سے اُٹھتا ہے کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ اُس کے نزدیک نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔

اللہ کے تصورِ خالق کا جدید حکماء مغرب کی ذہنی کاوشوں کا جائزہ:

آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گزریے اور دنیا کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالیے، ایک چیز آپ کو ہر مقام، ہر قوم اور ہر زمانے میں اللہ کا تصور بطور قدر مشترک ملے گا، لیکن اِس کے بارے میں بھی کسی مفکر کا تصور دوسرے سے نہیں ملتا۔ وہ سبھی اپنے اپنے موضوع کی بنیاد پر خدا کا تصور پیش کرتے ہیں۔

1۔ کانٹ کے نزدیک ''خدا وہ ہے جو انسانوں کو اخلاقی ضابطہ دیتا ہے۔''

2۔ ولیم جیمز خدا کو ''کائنات کا حصہ اعلیٰ'' قرار دیتا ہے۔

3۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ ''خدا اس قوت کا نام ہے جو خیر کا سبب ہے۔''

4۔ سر جیمس جینز کے نزدیک ''خدا سب سے بڑا ریاضی دان ہے۔''

5۔ برگسان کے نزدیک خدا سے مفہوم ''تخلیقی توانائی'' رہا ہے۔

6۔ آئن سٹائن ذاتی خدا کے تصور سے نا آشنا تھا، اس کے برعکس وہ یہ کہتا تھا کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے محدود وسائل کی مدد سے کارخانہ قدرت کا راز جاننے کی کوشش کرے، پھر اُسے پتہ چلے گا کہ اس تمام سلجھی ہوئی ڈور کے پیچھے نہایت لطیف انداز میں ایک غیر مادی اور نہ سمجھ میں آنے والی قوت کارفرما ہے، اس قوت کی ستائش اور تکریم، جو ہمارے فہم سے ماورا ہے، ہی میرا مذہب ہے!

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت سامنے آ گئی ہوگی کہ ''خدا'' کے صحیح تصور کے متعلق مفکرین کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ان میں سے ہر ایک کا تصور الگ اور تعریف جداگانہ ہے، یہ اس لیے کہ جب یہ لوگ خدا کے متعلق بات کرتے ہیں تو یہ بات خدا کے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس تصور کے متعلق ہوتی ہے جو یہ خدا کے متعلق اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ ہر فرد کے ذہن کا تراشیدہ تصور الگ ہوتا ہے، اس لیے ایک کا تصور دوسرے سے نہیں مل سکتا۔ شین کے الفاظ میں ''ایک فرد اور دوسرے فرد کا خدا جداگانہ ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک فرد کے احساسات وجذبات کی مختلف حالتوں میں بھی اس کا خدا مختلف ہوگا۔ ہر انسان اپنے جذبات کے تعمیر کردہ مندر کا پجاری ہے۔''

مغرب یعنی اہل کتاب کے مذاہب میں خدا کو وہ غیر مجسم روح سمجھا جاتا ہے جو جسم کی قید سے آزاد ہے۔ وہ ہر چیز دیکھ، سن اور جان سکتا ہے۔ المختصر وہ غیر جسمی ذہن یا عقل ہے، ایک ایسا شعور جو جسم سے الگ ہے مگر سوچنے، محسوس کرنے اور ارادہ کرنے اور اس پر عمل کرنے پر قادر ہے۔ خود جسم نہ ہوتے ہوئے بھی اجسام کی تخلیق اور انھیں محرک کرتا ہے اور محض ارادہ سے اشیاء کو وجود میں لاسکتا ہے۔ اِس کے ثبوت میں وہ عقل سے کئی دلائل دیتے ہیں۔ حُکمائے مغرب نے بہت سے دلائل دئے ہیں، لیکن ہم یہاں طوالت کے خوف سے بچنے کے لئے علامہ اقبال کی طرف سے دی گئی تین اہم دلیلوں کی نشاندہی کرنے پر ہی اِکتفاء کر رہے ہیں۔

1۔ کونی دلیل 2۔ غایتی دلیل 3۔ وجودی دلیل

یہ اولہ ثلاثہ اگرچہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ فکرِ انسانی نے جب کبھی ذات مطلق (واجب الوجود) کی جستجو کی تو چار و ناچار انہی تین راستوں پر گامزن ہونا پڑا، لیکن منطقی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی دلیل بھی ذات مطلق کے اثبات پر دلالت نہیں کرتی۔ ان کے دلائل پر شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور اِسی تنقید کی وجہ سے حُکمائے مغرب خود اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

1۔ پہلی کونی یا علی دلیل:

کونی یا علی دلیل کا واضح ترین بیان یوں ہے کہ ہر شے کا ایک سبب/ عِلت ہوتی ہے اور اسی لیے کائنات کا بھی ایک سبب ہے اور وہ مسبب الاسباب خدا کی ذات ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر خدا کا وجود ہے۔

اِس دلیل کی رو سے کائنات ایک معلولِ منتہا ہی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی کوئی عِلت بھی ہو۔ لیکن پھر ہر عِلت کے لیے چونکہ ایک دوسری عِلت کا وجود مستلزم ہے اور ذہن انسانی کے لیے ممکن نہیں کہ ایک ابدی تقہقر یعنی ماضی کی طرف ہٹتے ہوئے علت و معلول کے ایک لامتناہی سلسلے کا تصور کرتا چلا جائے۔ اس لیے ایک ایسی علت سے خدا کا وجود تسلیم کرنا پڑا جو کسی دوسری علت کا معلول نہیں۔ اِسے وہ عِلت اولیٰ، عِلت العلل اور یا پھر مسبب الاسباب کا نام دیتے ہیں۔

علی دلائل کا تجزیہ اور تنقید کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ سبب کسی زمانی وقوعہ یا عمل کا ہوا کرتا ہے لہٰذا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ سبب کے بدلے کسی شے کا وجود میں آنے کا سبب ہوتا ہے۔ لیکن کیا کائنات ایک شے ہے؟ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ لفظ ''کائنات'' ایک اسم جمع ہے اور کائنات اشیاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان تمام اشیاء کا جو موجود ہیں۔ علّی دلیل کا ناقد یہی اعتراض کرتا ہے کہ وقوعات کے منفرد اسباب کا طلب کرنا اور ان کے جوابات حاصل کرنا جائز ہے مگر وقوعات کے مجموعی سلسلہ کا الگ سے سبب ڈھونڈنا بے معنی ہے۔ دوسرے ہم اگر یہ فرض کرلیں کہ مکمل کائنات کا سبب ڈھونڈنا معقول ہے اور اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ اس کا سبب خدا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا سبب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ہر شے کا سبب ہوتا ہے'' کا معنی خدا کے سوا ہر شے کا سبب ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہیوم نے کہا ہے کہ ہم کیوں اس جگہ علت و معلول کا سلسلہ ختم کرتے ہیں۔ اگر رکنا ہی ہے تو کیوں نہ ہم کائنات یا دنیا پر ہی علّی سلسلہ کا اختتام تسلیم کریں جسے ہم کسی حد تک جانتے ہیں اور جس کا ہمیں تجربہ بھی ہے۔ بہرحال تجربی اقلیم سے ماورا اسباب و علل کا سلسلہ لے جانا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسباب کے متعلق ہمارا علم زمانی و مکانی اشیاء، اعمال و وقوعات تک محدود ہے، اس کے آگے اسباب کے متعلق کچھ کہنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ تجربات ہمیں اس قسم کی علّیت کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

2۔ دوسری غایتی دلیل:

خدا کے وجود کے حق میں تمام دلائل میں سے مقبول ترین غایتی (مقصدی) دلیل ہے۔ یہ دلیل تجربی ذرائع سے دنیائے مشاہدہ کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ خدا کا وجود ہے۔ یہ دلیل اس بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے کہ دنیا میں نظم اور مقصد کی بہت سی شہادتیں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم دنیا کی تربیت و تنظیم پر غور کریں تو اس نتیجہ سے احتراز ممکن نہیں کہ دنیا میں مقصد ہے اور یہ کہ اس کے پیچھے کسی عظیم معمار کا ہاتھ ہے اور وہی خدا ہے۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں:

''دلیل غائی میں معلول کی عِلت کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ ہمیں معلوم ہوجائے اسکی نوعیت کیا ہے۔ لہٰذا جب عالم فطرت کے مشاہدے سے کچھ یوں نظر آتا ہے کہ اس کے اعمال و افعال میں پیش بینی غرض و غایت اور تطابق کے آثار

پائے جاتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں ان سے ایک ایسی شاعر بالذات ہستی کا ثبوت مل جاتا ہے جس کے علم وقدرت کی کوئی انتہا نہیں۔''

اسی کو کانٹ نے ان الفاظ میں خدا کے تصور سے روشناس کرایا ہے۔

"We thus reach the idea of God as a individual necessarily existing, eternal, simple and all perfect supreme being, which is not the aggregate of finite realities but their unconditioned condition and ultimate cause"

ہم اسی طرح خدا کا ایک تصور ایسے فرد کا اخذ کرتے ہیں جس کی ذات لازمی، اندرونی، سادہ اور ہمہ گیر اقتدار کا وجود رکھتی ہے جو متناہی حقیقتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ان کی مسبب الاسباب اور علت اولیٰ ہے۔

غایتی دلیل کا تجزیہ وتنقید میں کہا جاتا ہے کہ: غایتی دلیل کی ابتدا اس بات سے ہوتی ہے کہ کائنات منظم ہے اور نظم نتیجہ ہے ترتیب وتنظیم کا۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ترتیب یا نظم ہمیشہ تنظیم کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ مغربی مفکر ہیوم نے کہا ہے ترتیب تنظیم کی شہادت اس صورت ہوتی ہے جبکہ یہ مشاہدہ ہوا ہو کہ ترتیب تنظیم سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نباتات وحیوانات میں جو نظم وضبط کے منافی حالات دیکھنے میں آتے ہیں، اُن میں ترتیب کا مشاہدہ کسی تنظیم کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔

دوسرے اب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے تخلیق کے مقصد کے حصول کے لیے تدریجی ارتقائی مقام اپنے سے پہلے مقام پر کافی نقصان پہنچنے کے بعد حاصل کیا جاتا ہے۔ ارتقائی عمل زندگی کی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد میں پیچھے رہ جانے والی کئی انواع مٹ صفحۂ ہستی سے مٹتی نظر آتی ہیں۔

3۔ تیسری وجودی دلیل:

جہاں تک وجود باری تعالیٰ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ فلسفہ اور فلسفیانہ استدلال ہماری اس سمت میں صرف نظری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ حتمی اور یقینی طور پر خدا کے وجود کے بارے میں علم صرف وحی کی روشنی یا مذہبی تجربے کی بنیاد پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کانٹ کا یہ استدلال کہ صرف ایک قادر ورحیم خدا کی موجودگی میں مکافات عمل کا امکان ہوسکتا ہے۔ اپنی جگہ بڑا وزنی اور دقیع ہے۔ خدا کا وجود اس اعتبار سے عقل عملی کا تقاضا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کو ضرور پورا ہونا چاہیے۔

اِس پر تنقید کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ یہ دلیل وہ منطقی مغالطہ ہے جسے اصطلاح میں مصادرہ قلوب کہا جاتا ہے۔ اِس میں ہم اس دعوی کو جسے ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے پہلے ہی سے ثابت شدہ تسلیم کر لیتے اور یوں منطقی کو حقیقی کا مترادف ٹھہراتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ علامہ اقبال خدا کے وجود کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے حکمائے مغرب کی اِنہی تین دلیلوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کونی (علّی)، غائی اور وجودی۔ یہ اولہ تلاثہ اگرچہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ فکر انسانی نے جب کبھی ذات مطلق (واجب الوجود) کی جستجو کی تو چار ونا چار انہی تین راستوں پر گامزن ہونا پڑا، لیکن منطقی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی دلیل بھی ذات مطلق کے اثبات پر دلالت نہیں کرتی۔ برعکس اس کے ان پر شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ان دلائل سے حکمائے مغرب کے نظریات اور ان پر انہی کی تنقید کی روشنی میں وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ (جاری ہے)

چیئرمین ادارہ

محمد اکرم راٹھور صاحب وفات پا گئے

انتہائی دُکھ سے یہ خبر دی جاتی ہے کہ محمد اکرم راٹھور صاحب آج صبح بتاریخ 25 اگست 2020ء بروز منگل وفات پا گئے ہیں۔ محمد اکرم راٹھور 9 ستمبر 1938ء کو جلال پور جٹاں ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ جلال پور جٹاں ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ بعد ازاں 1955ء میں کراچی میں تاج کمپنی میں ملازمت شروع کی۔ 1957ء میں تاج کمپنی ڈھاکہ میں اپنی خدمات شروع کیں سقوطِ ڈھاکہ تک وہیں رہے۔ اس دوران بنگالی بھی سیکھ لی۔ قیامِ ڈھاکہ کے دوران ماہنامہ طلوعِ اسلام 1959ء میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تو پھر دامنِ قرآنی سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔ 1963ء میں بزم طلوعِ اسلام ڈھاکہ قائم کی تو پرویز صاحب نے رسالہ طلوعِ اسلام میں انبساط و مسرت کے ساتھ ''مشرقی پاکستان میں قرآن کی شمع'' کے عنوان سے اعلان شائع کیا اور محمد اکرم راٹھور صاحب کو خط میں اقبال کا یہ شعر لکھ کر ارسال فرمایا:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

اس شعر میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ 1972ء میں ڈھاکہ سے VIA سعودی عرب کراچی آ گئے۔ بعد ازاں بزم ڈھاکہ کسی اور نام کے ساتھ چلتی رہی۔

1973ء سے 1990ء تک کراچی میں قیام رہا۔ پرویز صاحب عمرہ سے واپسی پر کچھ دن کے لئے محترم خالد گل کے ہاں قیام پذیر رہے تو کراچی کے اہلِ علم کا تانتا بندھا رہا۔ رئیس امروہی اور دیگر مشاہیر پرویز صاحب سے ملنے آتے رہے۔ علمی مجلسیں برپا رہیں۔ ایسی ہی ایک مجلس کے دوران عصر کا وقت ہو گیا تو پرویز صاحب کے ساتھ احباب نے نماز پڑھنا چاہی تو پرویز صاحب نے محمد اکرم راٹھور صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا اور خود ان کی امامت میں نماز پڑھی۔ عصر کے بعد بھی نشست جاری تھی کہ مغرب کا وقت ہو گیا پھر پرویز صاحب نے مغرب کی نماز کے وقت بھی ایسا ہی کیا اور اکرم راٹھور صاحب کے پیچھے باجماعت نماز ادا کی۔ محمد اکرم راٹھور صاحب تمام عمر پانچ وقت نماز کی پابندی کرتے رہے۔ مئی 2014ء سے تاحیات ادارہ کے چیئرمین رہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(ادارہ)

Surah *Al-'Hujraat* الحجرات
Durus-al-Qur'an: Chapter 4

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is June 11, 1982 and our lecture starts with verse 14 of Surah *Al-'Hujraat* الحجرات (49:16). We will cover the last three verses of this Surah today.

In the last lecture we saw that أَعْرَابُ (*'Araab*) claimed that they have Iman. They were told that they didn't have Iman but that they have simply surrendered to the Islamic state; that Iman had not entered the depth of their heart. The practical proof that Iman has entered one's heart is shown by one's obedience to divine laws, not by reciting few words. The next verse is: قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّـهَ بِدِينِكُمْ وَاللَّـهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَاللَّـهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (49:16) – Tell them (the people who only talk and do not work accordingly): "Do you want to convince Allah just by talking that you are extremely obedient and firm in faith? Remember, Allah knows everything that exists in the heavens and on earth. He is well aware of everything."

There is no need for you to inform Allah that by reciting few words you have acquired Iman. Allah knows everything what you do.

My dear friends, these are very important verses. The Quran is not talking only to the أَعْرَابُ (*'Araab*) of those days. This applies to us as well. It applies to all places and all times. The Quran is forever until the Day of Judgment. It is us also that Allah is talking to: How can you say that you have Iman by reciting few words? How can you announce to the world using multimedia platforms and loudspeakers that you have become Momin; that you have become trustworthy and honest? We know everything – whether hidden or visible. Therefore, you do not need to inform Us. Then the Quran tells these أَعْرَابُ (*'Araab*): يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُل لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم ۖ بَلِ اللَّـهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (49:17) – O Messenger! These people talk as if they have done you a favor by accepting Islam. Tell them: "Do not claim any favor on me. In fact this is Allah's Grace upon you that He has guided you to Iman. Thus, if you are really serious and true in your claim, then you must express your gratitude to Allah, rather than claiming that you have done favor to me by accepting Islam."

First of all these أَعْرَابُ (*'Araab*) were wrongly claiming that they have Iman (because their actions were not in tune with divine laws). And, on top of it, they were claiming that they have done favor to you O Messenger! Tell them: you have not done any favor to me by accepting Islam.

Do you see my friends, how this behavior of أَعْرَابُ (*'Araab*) parallels our own

behavior today? Each party is after every vote they can get. Sometime a single vote makes or breaks the future success of a party. So, a member who joins a party claims the he has done favor to the party and its leaders. This is what those Bedouins were claiming. The Quran rebuffs them.

O Messenger! Tell them that Islam is not a party; that Islam is not a numbers game. If you join Islam then it does no benefit to Islam but you. In fact it is Allah's benevolence upon you that He has guided you to Iman. Thus, if you are really serious and true in your claim, then express gratitude to Allah for guiding you to Iman, rather than claiming that you have done favor to me by accepting Islam. Allah knows everything: إِنَّ اللَّـهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّـهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (49:18) – Tell them that your saying so or reminders do not make any difference, for Allah knows the hidden realities and secrets of the entire universe. How can your deeds remain hidden from him? He sees all what you do. The result of every action is compiled according to Allah's Law of Requital.

There is no word in English or Urdu language that could express the meaning of مُنُّونَ. The root (م - ن - ن) of this word means receiving gift without any effort. The Quran has used this word for revelation, prophet-hood, and messenger-hood. The Quran says that this gift is not for any particular group or nation or for particular time but it is for entire humankind for eternity.

The Quran says: لَقَدْ مَنَّ اللَّـهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (3:164) – Allah has been gracious indeed to the Momineen when He raised from amongst their own people a Messenger who communicates His Laws to them, purifies and develops their character and teaches them the Book and its objectives. Hitherto, they were in a state of rank ignorance.

What is divine revelation? Why was it given to humans? What would be the condition of humans if it wasn't given? It is extremely important to understand these thing. Then only it may be appreciated what is this vital invaluable grift that was given to humans by Allah through the Prophet (PBUH). And he was instructed by Allah: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (5:67) – O Messenger! Deliver to humanity what is being sent down to you. Deliver Allah's message to people. And tell them: يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (11:51) – I ask for no return from you for the service which I am rendering to you. My recompense is with Him who has created me. Will you not reflect on what I say?

Similarity between animals and humans

My dear friends, why is this divine gift (of revelation) to humanity so important? This is extremely important point to think about. What is human being? Life started its evolutionary journey moving from one stage to the next until it reached it final stage of animal. When it moved ahead from the animal stage then it appeared in the form of humans. Therefore, there is a great similarity between human physical life and

animal life. Both follow similar physical patterns and laws. Scholars of this field of knowledge have found out through research three common attributes between animals and humans: 1) Self-preservation: to preserve one's life at all cost; 2) Self-defense: to defend oneself by force of power; and 3) Self-procreation: to advance one's generation through procreation.

Nature's control on animals

Nature has put full control on animal life and behavior. Once the stomach is full an animal does not care what happens to its meal. It feels contended until it feels hungry again. It does not hoard and amass. Animal procreation is also under nature's full control. Nature triggers animals into procreative mode and they procreate and nothing can stop them. They become obsessed with it. Once nature deactivates the procreative mode animals never engage in procreation until next time. Ghalib has put this beautifully:

Don't open the sack of the bud without blossom
When time is ready Nature will open it anyhow

So, animals will get the nod from Nature for it. Animal activity is under the full control of Nature. If a goat does not eat meat or if a lion does not eat grass it is because these are embedded in their nature. If a lion kills someone then the lion cannot be tried and charged with crime and punished for that. Animals do not have freewill and freedom of choice. Nature controls them. So, they are not accountable for their actions.

Humans have freewill as opposed to animals

When life reached the stage of humans then Nature lifted its control over human action. Allah granted them freewill and freedom of choice. Human actions therefore are not subject to the laws of nature. Only the human physical body is subject to physical laws. Otherwise, humans are completely independent and free to do whatever they choose. So, freedom of choice became the distinguishing hallmark of humans as compared to animals.

Imagine humans having physical needs similar to animals and Nature having lifted its control over them. Imagine humans being totally free to do whatever they choose but living among and interacting with other humans where each person fights for self-preservation without any limit or control of nature unlike animals, who, after their basic needs are met become satisfied and do not engage in hoarding and amassing more and more. But humans do not stop when their needs are met. Their greed drives them to keep on hoarding and amassing more and more. Their needs may be limited but their greed drives them for more and more – until they reach their grave. The Quran says: أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) – Humans become oblivious of the real destination of humankind because of obsession for more, avarice and rivalry. Greed drives them to excel the other in amassing wealth and

acquiring more and more. If humans confine their demands to fulfilling only their own needs, then what is acquired would be limited. However when the motive is to excel over each other, then there can be no limit. In that case the more one acquires the greedier one becomes, till such time that one reaches one's grave.

To achieve his greed man devises ingenious techniques based on deception and intrigues to exploit others. This is the misuse of freewill that God has endowed humans. Animals do not descend to such malicious levels. They cannot cheat and deceive other animals. Whatever nature has programmed into their brains that is what they follow instinctively. But man has been granted intellect which gives him enormous power over the Universe. In search of treasure he is able to conquer the forces of nature and he is able to even coopt other planets. So much power has been given to man and there is no control over him from Nature; he has been endowed with freewill and free choice; and he has to live among other human beings. If that is the case then what can protect and preserve humankind and future generations from man's malevolent activity?

Left to itself human intellect creates hell on Earth

The West used human intellect to acquire mastery over the forces of nature. But the West used this enormous power to subdue and to exploit others. Others followed suit and the battle of wits became the standard operating procedure of nations turning the world into hell. As a consequence, the same battle of wits is occurring at the individual level. One who is more clever and cunning is able to deceive others; he is able to cheat others; he is able to exploit and take advantage of others. And the poor and weak suffer, and, as a result turn into vassals of the rich and cunning. This mental sickness spreads like a virus and corrupts the whole society.

My dear friends, if you read West's literature then you will find that this battle of wits has led to insecurity all over the West. They build latest killing machines but they remain constantly worried. Their capitalist system generates wealth but they have the greatest numbers of suicide and mental diseases. This is the result of battle of wits. This is the result of using intelligence for their own short term selfish gains. How sad that humans are the hunters of humankind!

Human intellect is neither good nor evil. It is like a sword or gun that can be used for good or evil. If it is used to terrorize or kill innocent humans then this is evil. If it is used to kill a tyrant that will save innocent lives then is it is good. So, who is going to tell: use intelligence for good and not of evil? And, who will listen? Intelligence knows only self-preservation and its own benefits. Joad put it beautifully when he said: "A man's thought follows his desire much as the feet of a hungry dog follow his nose." This is a very apt metaphor to describe human activity. Human intellect is an extremely valuable tool. The question is how to use it?

Iqbal has explained it very well. He says:

In the world of good and evil man finds himself confused and helpless

He cannot understand what is beneficial or what is harmful for himself
No one can figure out what action is decent and what action is indecent
Which is a stable and smooth path and which path is unstable and rough

It is our daily experience what Iqbal says here. We think and ponder and consult others and decide matters using our intellect but we soon find out that our decision was disastrous. Sometimes it happens that the decision was beneficial for myself but turned out to be harmful to others.

Iqbal says that, left alone, intellect always seeks its own benefit, thinks for its own benefit, works for its own benefit. Iqbal calls this self-seeing intellect. He says:

Self-seeing intellect is unmindful and heedless of other's benefit
It sees only its own benefit but doesn't care about other's benefit

Everyone sees one's own benefit. Those who don't, are labelled insane. Intellect is only used for one's benefit, or in the larger context for one's own nation. Those who are clever outsmart others, fool others, deceive others, and take advantage of others. Iqbal has put this succinctly when says:

Intellect is cunning which dons many forms
Love is neither priest nor righteous nor wise

My dear friends, the English word "reason" more appropriately captures the meaning of Arabic word عقل (*'Aql*). The word "reason" as defined by Western philosophers is: to see things as they really are. So, one should not don one's own intellectual color goggles to interpret things. Things should be looked at as they really are.

The Quranic standard for using عقل (*'Aql*)

My dear friends, the Quran provides the proper guidance for using عقل (*'Aql*). It says it should not be used for self-benefit nor for a nation's benefit but that that it should be used for humanity's benefit because: وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17) – that which is of benefit to humanity only that abides on earth.

Now, how to decide what is beneficial to humanity. The Quran says that this is beyond عقل (*'Aql*) to decide this. Even if the entire world tries, it cannot decide what is beneficial to humanity. One's عقل (*'Aql*) left alone turns into cunning and clever manipulator in order to achieve one's own short-term benefit. The definition of "reason" – to see things as they are – requires that emotion must be kept out of it.

Only divine revelation is completely free from emotion

There is no way humans will be able to keep their emotions or desires out of decision making. Since Allah is beyond emotion, His revelation is objective and is not colored by any emotion: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (53:3) – Whatever he tells you in his capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the Revelation revealed to him from the Almighty. The Quran contains Divine revelation and the feelings or

personal opinion of the Messenger have no share in it. Human emotions and opinions are a result of personality and reflect a person's exposure in society. However the Revelation that one gets from divine source is unchangeable and cannot be affected by any of these.

The divine revelation keeps the entire humanity's benefit in front of it. It is independent of space and time restrictions because it comes from an infinite source. Therefore, it is a permanent value and a standard and guidance for all humanity for all time. Its guiding light will illuminate the path of humanity so that it can travel safely to its final destination. This is a great gift given to humanity by Allah. لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (3:164) – Allah has indeed been extremely gracious to the believers by sending His Revelation which helps propel humanity from darkness to light.

As Iqbal says:

Self-seeing intellect is unmindful of other's benefit
It sees its own benefit and doesn't care about others'
Divine revelation sees the benefit of all of humanity
It keeps its eyes focused on the benefit and growth of all

Therefore, it is not possible for anyone or any group to decide what will be the course that will benefit the entire humanity except divine revelation.

Human condition without revelation

Just think about it my friends! Humans possessing this enormous power of intellect without any control whatsoever. Humans possessing animal instinct of self-preservation, self-aggression/self-defense, self-procreation but no control over them by Nature. Living together and interacting with one another and free to potentially exploit one another. Imagine individuals or nations, each trying to surpass the other; each fighting for one's own self-interests and using the power by conquering nature to subdue each other. Possessing ICBMs and threatening to annihilate other nations if they don't accept their hegemony and servility. So, what would become the condition of the world from such human behavior? Well, exactly as it has happened. Humans have turned the world into hell.

My dear friends, do you see what a great gift to humanity it is to receive revelation from Allah? This is purely from the Grace of Allah. But He only gave it but did not force humans to follow it. He left to their freewill whether or not to follow it. Freewill is the essence of human dignity. If Allah forced humans to follow it then there would be no difference between humans and animals.

Allah sees that tyrants have turned the world into hell. It is not at all difficult for him to squeeze them to death. He does not do that because He does not want to directly usurp the freewill and freedom of choice of any human. He sent His guidance and He wants them to follow it by their own freewill and choice. This is a law and He does not violate His laws.

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امورِ دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گرمدغم ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
09

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

6 ستمبر یومِ دفاعِ پاکستان

